زندہ رُود
کا
تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر راشد حمید

زندہ رُود کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر راشد حمید

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

حکومتِ پاکستان

قومی ورثہ وثقافت ڈویژن

چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

Tel: [+92-42] 36314510, 99203573

Fax: [+92-42] 36314496

Email: info@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-573-8

طبع اوّل	:	۲۰۰۷ء (پورب اکادمی)
طبع دوم	:	۲۰۲۲ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۵۴۰ روپے
مطبع	:	ایچ آئی ٹریڈرز، لاہور

محل فروخت: گراؤنڈ فلور، ایوانِ اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور

ترتیب

دوسری اشاعت: ایک آدھ ضروری بات		۵
پیش گفتار		۹
باب اوّل	ڈاکٹر جاوید اقبال: سوانحی خاکہ	۱۳
باب دوم	زندہ رُود: تعارفی جائزہ	۳۹
باب سوم	زندہ رُود: جلد اوّل کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	۵۵
باب چہارم	زندہ رُود: جلد دوم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	۷۷
باب پنجم	زندہ رُود: جلد سوم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	۱۰۱
اشاریہ		۱۳۵

دوسری اشاعت: ایک آدھ ضروری بات

الحمدللّٰہ زندہ رُود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کی دوسری اشاعت بھی ممکن ہوئی۔ پہلی بار ۲۰۰۷ء میں شایع ہوئی تو جامعات کے شعبہ ہائے اُردو کے اساتذہ، طالب علموں اور عام قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ بہت جلد کتاب ختم ہوگئی اور مجھ سے فراہمی کے لیے رابطہ کیا جانے لگا لیکن مصنف کے لیے ایک سے زیادہ بار اپنی جیب سے کتاب چھاپنا ممکن نہیں ہوتا یا کم از کم میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ حسبِ ضرورت فوٹو سٹیٹ کے ذریعے ضرورت یا خواہش پوری کی جاتی رہی۔ میری خوش قسمتی کہ پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین صاحبہ، ڈائریکٹر اقبال اکادمی کی خاص توجہ کے سبب اشاعت کا امکان پیدا ہوا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے بلا تاخیر اس کی اشاعتِ نو کا بیڑا اٹھایا، جس کے لیے میں اُن کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۰۰۷ء میں جب کتاب شایع ہوئی تو میں نے قصداً ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال صاحب کو کتاب نہیں بھیجی۔ جائز طور پر یہ خیال دامن گیر رہا کہ زندہ رُود کا تجزیہ کرتے ہوئے متعدد مقامات پر لب ولہجہ تُرش، کھردرا اور کہیں کہیں بدتہذیبی کی حدوں کو چھوتا ہوا ہے لہٰذا یقیناً ڈاکٹر صاحب کو بدحظ ضرور کرے گا۔

ایک روز اپنے دفتر اکادمی ادبیات پاکستان میں مصروفِ کار تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے پوچھا گیا کہ کیا آپ وہی ڈاکٹر راشد حمید ہیں جن کی کتاب زندہ رُود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ حال ہی میں چھپی ہے؟ میں نے کہا، جی ہاں۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ میں ناصرہ جاوید اقبال بول رہی ہوں، ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال صاحب آپ سے اسی کتاب کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے ہنستے ہوئے مزید کہا کہ لیجیے بات کیجیے، وہ آپ کی اچھی طرح خبر لیں گے۔ میں سکتے میں آ گیا کہ اب ڈاکٹر صاحب کا سامنا کیسے کروں۔ خیر ڈاکٹر صاحب کی بے حد جان دار اور شان دار آواز نمودار ہوئی، جی ڈاکٹر راشد

مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ نے مجھے کتاب نہیں بھیجی مگر زندہ رُود کے بارے میں تھی، اس لیے مجھے ملنی تو تھی، سو مل گئی۔ میں نے مدہم سی آواز میں ڈرتے ڈرتے وضاحت کی کوشش آغاز کی ہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، آپ نے بہت اچھا تجزیہ کیا ہے زندہ رُود کا، مجھے خوشی ہے کہ جس توجہ اور انہماک سے آپ نے اِسے پڑھا ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ میرے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر فرمانے لگے، آپ نے لکھا ہے کہ میں زندہ رُود پر بارِ دگر غور کروں تو عرض ہے کہ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں، البتہ جو مجھ سے پوچھے گا یا رابطہ کرے گا تو کہوں گا کہ راشد حمید کا زندہ رُود کے بارے میں مقالہ ضرور زندہ رُود کے ساتھ ملا کر پڑھ لیں۔ میں نے زبردستی اپنی بات کہنے لیے جگہ بنائی اور عرض کیا کہ حضرت میں اپنے اس مختصر سے مقالے میں برتے گئے اپنے لب ولہجے پر آپ سے شرمندہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب گویا ہوئے کہ طالب علموں میں اگر یہ جرأت نہ ہو تو وہ تحقیق کیا خاک کریں گے۔ مجھے آپ کا لب ولہجہ دل چسپ لگا اور بلاشبہ آپ کی محنت قابلِ داد ہے۔

میں آج سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کس قدر وسیع قلب ونظر کی حامل شخصیت تھے۔ انھوں نے خوردنوازی کی حد کر دی، وگرنہ بعض مقامات پر جس تلخ زبان کا میں نے استعمال کیا وہ واقعی روا نہیں اور ڈاکٹر صاحب تو بالکل بھی اس کے سزاوار نہیں تھے۔

ڈاکٹر صاحب سے کچھ دیر پہلے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو کا ذکر محترم ومکرم، محسن ومشفق افتخار عارف صاحب سے کیا تو انھوں نے فی الفور اپنے عملے سے کہا کہ ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال صاحب کے گھر فون ملاؤ مگر پہلے فون پر مجھے لے لو۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ علیک سلیک کے بعد افتخار عارف صاحب نے کہا کہ اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی ''پاکستانی ادب کے معمار'' سلسلے کی کتاب آپ پر لکھوانا چاہتا ہوں، بتائیے کون لکھے، تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میری ایک نوجوان راشد حمید سے بات ہوئی ہے، وہ اسلام آباد میں ہی کہیں ہوتا ہے، اس نے زندہ رُود پر بہت اچھا مقالہ لکھا ہے، اگر وہ یہ کام کرنا چاہے تو مجھے خوشی ہوگی۔ افتخار عارف صاحب نے کہا کہ راشد حمید تو یہیں میرے پاس ہی ہے اور اکادمی ادبیات کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب دونوں بزرگوں کی گفتگو ختم ہوئی تو افتخار عارف صاحب کہنے لگے، دیکھیے بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں اور کیسے کشادہ ظرف۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان پر کتاب آپ لکھو۔

میں نے کہا کہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ علامہ اقبال کے بیٹے پر کتاب لکھوں اور وہ بھی اُن کی رضا مندی کے ساتھ۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ ۲۰۰۷ء کو سونپی گئی ذمہ داری میں نے ابھی تک پوری کیوں نہیں کی۔ مختصراً عرض ہے کہ میں نے چند ہفتوں بعد سوانحی کوائف پر مشتمل پہلا باب ڈاکٹر صاحب کو بھیجا اور چند دنوں بعد ٹیلی فون پر بات کی تو انھوں نے فرمایا کہ آغاز اچھا ہے مگر میری خواہش ہے کہ آپ ابھی رُک جائیں، کیوں کہ کچھ مکمل کتابیں، کچھ خطوط اور کچھ مقالات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس میں سے کچھ اُردو اور کچھ انگریزی زبان میں ہیں۔ یہ مواد چھپ جائے تو آپ کے لیے کام کرنا اور بھی آسان ہو جائے گا۔ اُن کا مؤقف بالکل درست اور جائز تھا، سو میں رُک گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی اوپر تلے متعدد کتابیں چھپتی رہیں اور بالآخر ڈاکٹر صاحب بھی دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک عرصہ ہوا کہ میری طبیعت اس طرف راغب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اب چند دنوں سے اعصاب اس کام کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ اللہ کریم توفیق ارزاں فرمائے تو بہت جلد کتاب مکمل ہونے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔

زندہ رُود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کی دوسری اشاعت کا موقع میسر آیا ہے تو اساتذۂ کرام اور بعض دوستوں سے مشاورت کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے مِن وعَن شایع کرنا ہی بہتر ہے، سو زندہ رُود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کا نیا روپ ماسوائے پروف کی بعض غلطیاں کم کرنے کے، کم وبیش ویسے کا ویسا قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

کتاب کے آخر میں اشاریہ فراہم کر دیا گیا ہے جو کہ اشاعت میں ایک مفید اضافہ ہے۔ بہت ہی محترم اور بھائیوں جیسے دوست محمد شاہد حنیف صاحب نے یہ اشاریہ تیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اشاریہ سازی کے فن میں خوب مہارت سے نوازا ہے۔ اشاریہ سازی کے فن میں اس وقت اُردو کے سب سے بڑے ماہر کے طور پر اُن کا بے حد وحساب احترام کیا جاتا ہے۔ (ماشاءاللہ) مَیں خاص طور پر ان کا شکر گزار ہوں۔

راشد حمید
ادارہ فروغِ قومی زبان
اسلام آباد

پیش گفتار

زندہ رُود ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال کی تصنیف ہے۔ یہ علامہ اقبال کی سوانح عمری ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ میں نے ایم فل اقبالیات کا کورس ورک مکمل کرنے کے بعد تحقیق کے لیے زندہ رُود کے تجزیاتی مطالعے کا انتخاب کیا، تو ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے میرا موضوع نہ صرف پسند فرمایا، بل کہ ہر دو بزرگوں نے حوصلہ افزائی بھی کی۔ جب میں نے خواہش ظاہر کی کہ زندہ رُود پر مقالہ لکھنا چاہتا ہوں تو استادِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے کہا کہ پہلی جلد پر کریں اور باقی دو پر کوئی اور طالب علم کام کر لے گا۔ میں مصر رہا کہ تینوں جلدوں پر کام کروں گا، سو مجھے اجازت مل گئی اور یوں تینوں جلدوں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ میرا موضوع ٹھہرا۔

میرا یہ کام زندہ رُود کی تینوں جلدوں کے تحقیقی اور تنقیدی تجزیے اور مطالعے پر مبنی ہے۔ حتی الامکان سعی کی ہے کہ اپنے کام کو جدید تحقیقی تقاضوں کے مطابق انجام دوں۔ میں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ اپنی زیادہ تر توجہ زندہ رُود پر مرکوز رکھوں، اس لیے دائیں بائیں کی کتابوں سے محض اقتباسات نقل کر کے مقالے کا حجم بڑھانے سے اجتناب کیا، جہاں ضروری ہوا، بنیادی مآخذ کو حوالہ بنایا، لیکن غیر ضروری طور پر کتابوں کی تعداد نہیں بڑھائی۔ زندہ رُود کی ترتیب و اشاعت سے قبل علامہ اقبال کی کم و بیش تمام سوانح عمریاں میرے مطالعے میں رہی ہیں، مگر جہاں ضروری ہوا، میں نے مقالہ نویسی میں ان سے استفادہ کیا ہے، ورنہ زیادہ تر کتابیں تو محض تصورات (Concepts) کی تفہیم بہتر کرنے میں میرے افادات کا حصہ رہی ہیں۔ اقبالیاتی ادب کی بیسیوں کتابوں سے استفادہ کیا، مگر بہت کم کے اقتباسات دیے ہیں۔ تمام تر توجہ زندہ رُود

تک رہی ہے۔ زیادہ تر اقتباسات اسی کتاب سے نقل کیے اور اپنے خیالات کی تائید میں ان سے اخذ واستفادہ کیا ہے۔

زندہ رُود کی جلد اوّل اور سوم کا زیادہ تر حصہ سوانح حیات کے حوالے سے بہت قیمتی اور نادر معلومات پر مشتمل ہے، مگر دوسری جلد اپنی تشنگی کے باعث پہلی اور تیسری جلد کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ میں نے اپنے طالب علمانہ مطالعے کی حد تک بعض حوالوں سے اس پر تنقید کی ہے؟ اسے کسی طرح کی خودنمائی اور خودسری نہ سمجھا جائے، میں اپنے تمام تر علمی انکسار کے ساتھ مقالہ کو پیش کر رہا ہوں، اس میں یقیناً کئی طرح کی خامیاں ہوں گی، لیکن میں نے اپنے تئیں اخلاص سے صداقت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

زندہ رُود اقبال کی سوانح عمریوں میں نمایاں ترین مقام کی حامل سوانح عمری ہے۔ اسے سوانح نگاری کا حرفِ آخر تو قرار نہیں دیا جاسکتا، مگر علمی دُنیا میں موجود اقبال کے سوانحی ادب میں ممتاز اور منفرد سوانح عمری ضرور گردانا جاسکتا ہے۔

میں نے اپنے مقالے کو حسبِ ذیل عنوانات میں تقسیم کیا ہے:

۱- ڈاکٹر جاوید اقبال: سوانحی خاکہ

۲-زندہ رُود: تعارفی جائزہ

۳-زندہ رُود: جلد اوّل کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

۴-زندہ رُود: جلد دوم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

۵-زندہ رُود: جلد سوم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

پہلا باب ڈاکٹر جاوید اقبال کے سوانحی احوال وآثار پر مشتمل ہے۔ مستند مآخذ اور مصادر کی مدد سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ اس ترتیب کاری کے عمل میں ان کی زندگی کا کوئی نمایاں گوشہ اوجھل نہ رہے۔ سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے علمی وادبی سرمائے کی تفصیل بھی دی گئی ہے، تاکہ ذاتی حالات، ذہنی اور فکری سرمائے کے ساتھ باہم مل کر ان کی شخصیت کے مکمل خدوخال ابھار سکیں۔ اس باب کی تحریر وترتیب میں ثانوی حوالوں سے کام نہیں لیا گیا، بل کہ تمام تر لوازمہ ان کے مکالموں اور اُن کی سوانحی تحریروں سے اخذ کیا گیا

ہے۔ مقالہ پیش کرتے وقت اس ضمن میں جو مواد میسر تھا، اس سے کام لیا گیا، لیکن اب ان کی خودنوشت سوانح عمری، اپنا گریباں چاک سے بھی استفادہ کر لیا گیا ہے۔ کوشش رہی ہے کہ ان کی زندگی کے اہم واقعات، زبانی تسلسل کے ساتھ ضبطِ تحریر میں آ جائیں۔

دوسرا باب زندہ رُود کے تعارفیے پر مبنی ہے۔

تیسرے باب سے لے کر پانچویں باب تک زندہ رُود کی تینوں جلدوں کا علیحدہ علیحدہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ہر جلد کے مندرجات اور اُن کی تحقیقی حیثیت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ڈاکٹر جاوید اقبال کی محنت اور کاوش کی تحسین بھی گئی ہے اور جہاں کہیں کوئی علمی، تحقیقی اور لسانی فروگذاشت نظر نواز ہوئی، اس کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔

آخر میں کتابیات کا اندراج کیا گیا ہے، یہاں صرف ان کتابوں کا ذکر کیا گیا، جن سے براہ راست مقالہ نویسی کے دوران میں اخذ و استفادہ کیا گیا اور محض کتابوں کی تعداد بڑھانے کی سعیِ نامشکور نہیں کی۔

یہ کام کسی صورت میں تکمیل پذیر نہ ہو سکتا، اگر مجھے اپنے بزرگوں اور دوستوں کا تعاون حاصل نہ رہا ہوتا۔ اپنے نگران کار ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور صدر شعبۂ اقبالیات ڈاکٹر محمد صدیق خاں شبلی کا شکر گزار ہوں کہ ان ہر دو بزرگوں کی شفقت، توجہ اور کرم فرمائی سے میں اس قابل ہوا کہ بروقت مقالہ جمع کرا سکوں۔

میں صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر نثار احمد قریشی کا بھی ممنون ہوں کہ مقالہ نویسی کے دوران میں انھوں نے بے پناہ تعاون کیا۔ میں جب بھی یونی ورسٹی حاضر ہوا، انھوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

شعبۂ اقبالیات کے ریسرچ اسسٹنٹ محمد اکرم نے بھی میری حوصلہ افزائی کی، میں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پروفیسر محمد خلیل سے میں نے زندگی گزارنے کا اُسلوب اور اسے برتنے کا قرینہ سیکھا، وہ میرے ماموں تھے۔ اُردو شعر و ادب کے ساتھ ان کا تعلق فطری تھا، تصوف سے بھی ان کا علاقہ بہت گہرا اور کسی قدر تجرباتی تھا۔ جب میں نے ایم فل میں داخلہ لیا، تو وہ حیات تھے۔ انھوں نے مجھے حوصلہ تو دینا ہی تھا، دُعاؤں سے بھی نوازا۔ آج جب مقالہ تکمیلی مراحل

میں داخل ہو رہا ہے، تو میں ان کی شفقت سے محروم ہو گیا ہوں، خدا انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے، وہ میرے لیے ایک آئیڈیل تھے۔

اس مقالے کی ترتیب و تہذیب میں میری شریک حیات صائمہ اور دونوں بیٹیوں مریم اور حریم نے بھی بے پناہ دل چسپی کا اظہار کیا، انھوں نے مجھے اپنا وقت دیا، مقالے کی تکمیل کے مراحل میں میرے ساتھ رہیں، مجھے حوصلہ دیا اور میں اپنے اس تحقیقی میدان میں ثابت قدم رہا۔

ڈاکٹر راشد حمید

ڈاکٹر جاوید اقبال

سوانحی خاکہ

نام: جاوید اقبال[۱]

تاریخ پیدائش: ۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء[۲]

شب ۹ بج کر ۳۰ منٹ پر[۳]

جائے ولادت: سیالکوٹ

والد گرامی: علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال [پ: ۹/نومبر ۱۸۷۷ء-م: ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء]

والدہ ماجدہ: سردار بیگم [وفات ۲۳/مئی ۱۹۳۵ء، بیالیس سال کی عمر میں]

بچپن میں سرہند شریف کا سفر: ۲۹/جون ۱۹۳۴ء

''میری ولادت سے کچھ ماہ پیشتر میرے والد سرہند تشریف لے گئے۔ شیخ احمد کے مزار پر حاضری دی اور دُعا کی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اولادِ نرینہ سے نوازا تو اسے ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ چناں چہ جب میں تقریباً دس برس کا ہوا (۲۹/جون ۱۹۳۴ء) تو مجھے ہمراہ لے کر سرہند شیخ احمد کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا۔ گنبد کے تیرہ وتار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی۔ میرے والد تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر انھوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا۔ گنبد کی تاریک فضا میں ان کی رندھی ہوئی مدہم آواز گونج رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں''۔[۴]

بہن: منیرہ بیگم [پ: ۳۰/اگست ۱۹۳۰ء]

ماموں: خواجہ عبدالغنی
تایا: شیخ عطا محمد
تعلیم:
پرائمری: سیکرڈ ہارٹ مشن ہائی سکول، لاہور
''مجھے نو برس کی عمر میں سیکرڈ ہارٹ سکول سے فارغ کر دیا گیا کیونکہ اس سے بڑی عمر کے لڑکے لڑکیوں کو سکول میں نہیں رکھتے تھے''۔(۵)
سینٹ فرانسس سکول، انارکلی، لاہور
''ایک سال کے لیے سینٹ فرانسس سکول، انارکلی میں داخلہ لینا پڑا''۔(۶)
میٹرک: سنٹرل ماڈل ہائی سکول، لاہور
اسلامیہ ہائی سکول، بھاٹی گیٹ
''مارچ ۱۹۳۹ء میں والد کی وفات سے تقریباً ایک سال بعد نتیجہ نکلا اور میں نویں کے امتحان میں پھر فیل ہو گیا۔ سنٹرل ماڈل اسکول میں اب دسویں جماعت میں جا سکنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس لیے چودھری محمد حسین نے انجمنِ حمایت اسلام میں اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے مجھے سنٹرل ماڈل اسکول سے اٹھوا کر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ کی دسویں جماعت میں داخل کرا دیا''۔(۷)
۱۹۴۰ء میں سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔(۸)
ایف اے: گورنمنٹ کالج، لاہور؛ ۱۹۴۲ء تھرڈ ڈویژن(۹)
بی اے (آنرز): گورنمنٹ کالج، لاہور؛ ۱۹۴۵ء؛ سیکنڈ ڈویژن(۱۰)
ایم اے (انگریزی ادبیات): گورنمنٹ کالج، لاہور؛ سیکنڈ ڈویژن
''۱۹۴۶ء میں اچانک مجھے ایک حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔ میں ایم اے (انگریزی) کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ میری تیاری میں تو کوئی کمی نہیں تھی لیکن آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ فیل کیوں ہوا۔ عین ممکن ہے کہ انگریزی ادب کی تاریخ، شاعری، ڈرامہ، ناول، تنقید نویسی وغیرہ کے بارے میں نقطۂ نظر عموماً انوکھا ہوا کرتا تھا، ممتحن کو پسند نہ آیا ہو۔ چودھری محمد حسین سے میں نے شکایت کی تو انھوں نے فرمایا کہ بعض اوقات آگاہی کا تکبر انسان کی ناکامی کا باعث بنتا ہے۔ اسی لیے علم کی تحصیل کے دوران عجز کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ میرا ارادہ ایم

اے (انگریزی) کے بعد ہر قیمت پر ایم اے (فلسفہ) کرنے کا تھا۔ پس میں نے گورنمنٹ کالج کے فلسفہ کے پروفیسروں قاضی اسلم اور عبدالحمید سے مشورہ کرنے کے بعد ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لے لیا۔ پہلے سال بغیر کسی تیاری کے میں نے دوسری بار ایم اے انگریزی کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں کامیاب ہو گیا۔ بعد ازاں میری تمام تر توجہ فلسفہ کی طرف مبذول ہو گئی''۔(۱۱)

ایم اے (فلسفہ): گورنمنٹ کالج، لاہور؛ ۱۹۴۸ء: فرسٹ کلاس فرسٹ(۱۲)

پی ایچ ڈی: موضوع: مسلم سیاسی فلسفے کا ارتقاء: برصغیر پاک و ہند کے حوالے سے

نگران مقالہ: پروفیسر اے جے آربری(۱۳)

ڈاکٹر جاوید اقبال، اپنا گریباں چاک کے صفحہ ۸۵ اور ۸۶ پر لکھتے ہیں:

''۱۹۵۴ء کے وسط میں میرا تحقیقی مطالعہ مکمل ہوا اور میں نے قاعدے کے مطابق اس کی دو جلدیں یونی ورسٹی کے دفتر میں داخل کرا دیں، تیسری جلد اپنے پاس رکھی۔ تین ماہ گزرنے کے بعد غالباً اکتوبر کے مہینے میں، اورینٹل فیکلٹی میں اس موضوع کے ماہر دو پروفیسروں کے سامنے پیش ہوا، جنھوں نے مقالہ پڑھا ہوا تھا اور اس کے ہر باب سے متعلق تقریباً دو گھنٹوں کی بحث کے بعد زبانی امتحان ختم ہوا..... میں نے لندن میں قیام کے دوران دو مرتبہ بار فائنل کا امتحان دیا۔ پہلی بار فیل ہوا لیکن دوسری بار کامیاب ہو گیا۔ اسی دوران کیمبرج یونی ورسٹی نے بذریعہ خط اطلاع دی کہ میرا تحقیقی مقالہ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے منظور ہو گیا ہے اور ڈگری کی وصولی کے لیے میں یونی ورسٹی کی تقریب میں شریک ہو سکتا ہوں مگر میں نے تقریب میں شرکت سے معذرت کی اور استدعا کی کہ ڈگری بذریعہ ڈاک مجھے ارسال کر دی جائے لہٰذا ایسا ہی کر دیا گیا۔ اِنز آف کورٹ سے بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور میں نے لندن سے پاکستان روانہ ہونے کی تیاری شروع کر دی۔''

بار ایٹ لا: کیمبرج یونی ورسٹی، لندن

''لندن میں بیرسٹری کے امتحان دو حصوں میں دیے جا سکتے تھے۔ ہر سال میں چار مرتبہ پہلے حصہ کے چھے پرچوں کے امتحان علیحدہ علیحدہ بھی ہوتے تھے مگر دوسرے حصہ کے چھے پرچوں کے امتحان ایک ساتھ لینے پڑتے تھے۔ علاوہ اس کے تین سال کی مدت میں لنکنز ان کے مخصوص تعداد میں ڈنرز میں شرکت بھی ضروری تھی۔ میں نے تین سال میں لندن جا کر موج کے ساتھ ڈنرز کی تعداد پوری کی اور اسی عرصہ میں ایک ایک کر کے بار کے پہلے حصہ کے چھے

پرچوں کے امتحان بھی پاس کر لیے۔ جہاں تک بار کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے، میں نے طے کیا کہ پی ایچ ڈی کا تھیسس مکمل کرنے کے بعد کیمبرج سے لندن منتقل ہونے پر اس سے بھی فراغت حاصل کروں گا''۔(۱۴)

اساتذہ:

''ماسٹر تارا چند(۱۵)، ماسٹر غلام ناصر خاں(۱۶)، چودھری محمد حسین(۱۷) سراج الدین، اشفاق احمد، لطیف، ڈکنسن، پروفیسر منٹگمری واٹ، پروفیسر روبن لیوی، پروفیسر گب، پروفیسر آربری(۱۸)، ڈنلوپ، ایرانی حیدری،(۱۹)

مصروفیات/ملازمت:

''انگلستان میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں جاوید اقبال بی بی سی کی مشرقی سروس سے دس منٹ کا ایک انگریزی پروگرام کیمبرج لیٹر، کرتے رہے۔''(۲۰)

جزوقتی لیکچرار/ریڈر: پنجاب یونی ورسٹی، لا کالج ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۰ء تک(۲۱)

''میں کالج میں 'ایکووٹی' پڑھاتا تھا اور میرے لیکچر سننے کے لیے دوسری کلاسوں کے طلبا بڑے شوق سے آیا کرتے تھے۔ اس پرچہ کا نتیجہ بھی اکثر بہت اچھا نکلا کرتا۔ یہ سلسلہ چودہ برس (یعنی ۱۹۷۰ء) تک جاری رہا۔ آخری چند سالوں میں، میں نے ریڈر کے طور پر بھی پڑھایا۔''(۲۲)

ہائی کورٹ میں وکالت ۱۹۵۶ء۔۱۹۷۰ء(۲۳)

۱۹۷۰ء میں کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں الیکشن لڑا، مگر ناکام ہوئے۔

جولائی ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۶ء تک لاہور ہائی کورٹ کے جج رہے۔

آخری چار سال چیف جسٹس رہے۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک سپریم کورٹ کے جج رہے اور اسی عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔

اعزازات:

سلور میڈل: (جاوید اقبال نے سکول کے زمانہء طالب علمی میں جولیس سیزر کے کردار انتھونی کی تقریر سنا کر حاصل کیا۔)

گولڈ میڈل: (ایم اے فلسفہ میں اوّل آنے پر)(۲۴)

۱۹۸۹ء میں ولانووا کیتھولک یونی ورسٹی، (امریکہ) نے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔[۲۵]
مئی ۱۹۹۰ء میں سلجوق یونی ورسٹی قونیہ (ترکی) نے ''اسلامک لٹریچر اینڈ سائنس'' پر پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔[۲۶]

۱۹۸۶ء میں زندہ رُود (جلد اول) کی اشاعت پر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد نے پچاس ہزار روپے کا انعام دیا۔

۱۹۸۸ء میں زندہ رُود کی تینوں جلدوں پر پچاس ہزار روپے کا صدارتی انعام ملا۔

۱۹۹۴ء میں سینیٹر منتخب ہوئے۔

شادی: جون ۱۹۶۴ء میں نکاح ہوا۔[۲۷]

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں ناصرہ جاوید اقبال سے شادی ہوئی۔[۲۸]

''میری بیوی ناصرہ کا تعلق ایک تاجر اور صنعت کار گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی جائیداد اور اپنی خاندانی کمپنیوں میں حصص کی مالک تھیں۔ انھوں نے جاوید منزل میں آتے ہی میرے والد کے زمانے کی گھر سے منسلک دو دکانوں (جن کا چھبیس روپے فی دکان ماہوار کرایہ ملتا تھا) سے پرانے کرایہ داروں کو نکالا اور اُن کی تعمیر نو کر کے فی دکان دو سو روپے ماہوار کے حساب سے کرایہ پر دے دیں۔ بعد ازاں انھوں نے ان دکانوں کے پیچھے تین چار کوٹھریاں بھی ساتھ کی گلی میں کھول کر انھیں دکانوں میں منتقل کر دیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان سب دکانوں کے اوپر دو نہایت نفیس فلیٹ بنوا کر انھیں بھی کرایہ پر چڑھا دیا۔ اس کے نتیجے میں تین برس کی مدت میں جہاں اس حصۂ جائیداد کا کل باون روپے ماہوار کرایہ ملتا تھا، اب چھ ہزار روپے کرایہ ملنے لگا''۔[۲۹]

اولاد: دو بیٹے:[۳۰]

(۱) منیب اقبال: ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔[۳۱]

(۲) ولید اقبال: یکم اگست ۱۹۶۷ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔[۳۲]

ادبی خدمات:

افسانے[۳۳]: (۱) 'غلبہ' راوی، مجلّہ، گورنمنٹ کالج' لاہور، ۱۹۴۲ء

(یہ جاوید اقبال کا ۱۹۴۷ء کی خوں ریزی اور فسادات کے موضوع پر لکھا گیا پہلا افسانہ ہے۔

ملاحظہ فرمائیں:)(۳۴)

(۲)'بحران' مطبوعہ در سویرا، لاہور شمارہ ۴ (۱۹۴۷ء میں خوں ریزی اور فسادات کے موضوع پر لکھا گیا۔)

ڈرامے:(۳۵)

جاوید اقبال کے بعض ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئے اور اُن میں امتیاز علی تاج اور رفیع پیر نے بھی حصہ لیا۔(۳۶)

۱-'فلسطین' مطبوعہ 'راوی مجلّہ گورنمنٹ کالج' لاہور

۲-'سڑک' راوی، ۱۹۴۸ء

۳-'چیچک' سویرا، لاہور، شمارہ ۱

۴-'سفر' ماہِ نو، کراچی' ۱۹۴۹ء

۵-'تعبیر' ماہِ نو، کراچی' ۱۹۴۹ء

۶-'رہنما' راوی، ۱۹۵۰ء

۷-'عذرا' راوی، '۱۹۵۰ء

۸-'گردش' سویرا، لاہور، شمارہ ۲۲

۹-'معصوم' سویرا، شمارہ ۲۴

۱۰-'امید کا دامن' سویرا، شمارہ ۲۵

۱۱-'ہیلو نقوش، لاہور، شمارہ ۳

۱۲-'مرتا کیا نہ کرتا' نرگس، بمبئی' ۱۹۴۶ء

سفر نامہ:

چین کے ۱۹۶۳ء کے سفر کے بارے میں تاثرات تقریباً تیرہ قسطوں میں سول اینڈ ملٹری گزٹ اخبار میں ۱۹۶۴ء میں چھپے۔(۳۷)

ٹیلی وژن ڈرامے:

۱۳-سم

۱۴- چور

۱۵- محمد بن قاسم

۱۶- سلطان مراد اور معمار

خاکے: (۳۸)

اپنا گریباں چاک میں جاوید اقبال صفحہ ۲۱۳ اور ۲۱۴ پر یوں رقم طراز ہیں:

''۴/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو سپریم کورٹ سے ریٹائرمنٹ پر میں نے سامان اسلام آباد کے ریسٹ ہاؤس سے اٹھایا اور اپنے گھر لاہور آ گیا۔ میرا سب سے پہلا مقصد اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر کوئی کام تلاش کرنا تھا۔ میں نے سیاست چھوڑ کر جج قبول کی تھی اور اب جج کا چغا بھی اتار پھینکا تھا۔ اس سے پیشتر مصوری اور مجسمہ سازی کے شغل کو اس لیے خیر باد کہا کہ مجھ میں ایک اچھا آرٹسٹ بن سکنے کی اہلیت نہ تھی اور درمیانہ آرٹسٹ بننا میری فطرت کو قبول نہ تھا۔ البتہ ڈرامہ نویسی میں چند ایک نئے تجربے کرنے کی کوشش کی، لیکن پاکستان میں سنجیدہ ڈراموں کے لیے اسٹیج کی عدم موجودگی کے سبب اس صنف کا مستقبل مجھے دکھائی نہ دیتا تھا۔ جہاں تک ریڈیو یا ٹی وی کے لیے ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے تو ان اداروں کا سنسر نہایت مایوس کن تھا۔ عجیب وغریب قسم کے اعتراضات اٹھائے جاتے تھے اور جدت پسندی کو بدعت سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً میں نے ٹی وی کے لیے 'محمد بن قاسم' کے موضوع پر نئے انداز میں ڈرامہ لکھا۔ اعتراض ہوا کہ سندھ میں راجہ داہر کے قبیلے کے لوگ ناراض ہو جائیں گے۔ میں نے ''سم'' نامی ایک کھیل تحریر کیا جس میں یہ دکھلانا مقصود تھا کہ حیات بعد موت کی تحصیل ہر کسی کا حق نہیں بلکہ صرف وہی اس انعام کے مستحق ہوں گے جو اپنی موجودہ زندگی میں کوئی تخلیقی کام کر جائیں۔ تمثیل علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات بعد ممات پر مبنی تھی اور مقصد ایک بے حس قوم کو تخلیقی یا کارہائے نمایاں انجام دینے کی اہمیت کا احساس دلانا تھا۔ لیکن ٹی وی کا اعتراض تھا کہ یہ تصور اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ''سلطان مراد اور معمار'' نامی ڈرامہ (جو علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم سے ماخوذ تھا) عدلیہ کے روبرو مساوات اور قصاص کے اسلامی اُصولوں پر مبنی تھا۔ تمثیل کا اہم نکتہ یہ تھا کہ مجرم کو قصاص کے طور پر معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر ڈرامہ بھٹو کو پھانسی دیے جانے کے بعد ٹیلی کاسٹ کیا گیا، حالاں کہ ان کے ٹرائل کے دوران ٹی وی والوں نے ریکارڈ کیا تھا..... بالآخر ڈرامہ نویسی سے توبہ کر لی۔ بہرحال بنیادی طور پر ایک لکھنے پڑھنے

والے شخص کی حیثیت سے میں لکھنے پڑھنے کے سوا اور کس کام کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ میں نے کلام اقبال کے اُردو حصے کی تشریح لکھنے کا ارادہ کیا اور اس پر کام بھی شروع کر دیا۔ مگر یہ کام اسی طرح ادھورا رہ گیا جیسے بڑی محنت سے میری تحریر کردہ ''رضیہ سلطان'' نامی تمثیل ادھوری رہ گئی تھی۔ اس طویل یونانی المیہ کی طرز کے ڈرامے میں میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اسلامی تاریخ میں شیطان نے کیا کردار ادا کیا ہے اور کس طرح ہماری نہایت اہم تاریخی ہستیاں خلفائے راشدین کے زمانہ سے لے کر اب تک اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی مانند کھیلتی چلی آ رہی ہیں۔ شاید بہتر تھا کہ یہ ڈرامہ مکمل نہ ہو سکا کیونکہ ہم تو اپنی بری بھلی تاریخ کو بھی مذہب کا حصہ قرار دیتے ہوئے مقدس سمجھتے ہیں''۔

۱- اقبال: ایک باپ کی حیثیت سے

ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی کتاب اپنا گریباں چاک میں صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں:

''مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ سردار صاحب (سردار عبدالرب نشتر) نے والد کے بارے میں تحریر کردہ میرے بیشتر مضامین مثلاً ۱۲/اپریل ۱۹۴۶ء کے یوم اقبال پر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر کردہ 'اقبال بحیثیتِ ایک باپ' ۱۹۴۸ء کے یوم اقبال کے موقع پر اسلامیہ کالج ہال میں پڑھا ہوا میرا مقالہ ''اقبال کا تصورِ اجتہاد' اور بعد ازاں 'اقبال کے مابعد الطبعیاتی تصور میں اخلاقیات کا مقام' جو اُردو اور انگریزی اخباروں میں چھپا، سب پڑھے ہوئے تھے''۔

اس مضمون کا انگریزی ترجمہ سیّد محسن رضا نے کیا۔ جو گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور کے جریدے تخلیق مکرر ۲۰۰۲ء میں چھپا۔

۲- چودھری محمد حسین

سعشہ خان اپنی کتاب ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات میں صفحہ ۵۳ پر رقم طراز ہیں:

''شخصیت نگاری ڈاکٹر جاوید اقبال کے فن کا ایک اور زاویہ ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے والد بزرگوار علامہ اقبال اور اپنی جائیداد کے ولی چودھری محمد حسین کی شخصیات پر دو مضمون لکھے۔ سچائی اور سادگی کے سبب یہ مضمون ادبی درجہ حاصل کر گئے۔ ان مضامین کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خاکہ نگاری کی بہت سی خصوصیات موجود ہیں، اس لیے یہ مضامین محض شخصیت نگاری کے زمرے میں نہیں آتے۔ ان کا مطالعہ ادبی خاکوں کے طور پر بھی

کرنا چاہیے............۔اقبال ....ایک باپ کی حیثیت سے۱۲/اپریل ۱۹۴۶ءکو یومِ اقبال کے موقع پر ریڈیو سٹیشن لاہور سے نشر کیا گیا''۔

مضامین:[۳۹]

۱-ارسطو کا تصورالمیہ

۲-نصب العین کا مسئلہ (اس موضوع پر کئی مضامین امروز میں شائع ہوئے۔)

۳-The Problem of Morality in Developing Societies

۴-قائداعظم-ایک عظیم انسان [۱۹۴۶ء میں انگریزی اخبار ڈان میں چھپا۔[۴۰]

۵-اسلام اور پاکستان [۱۹۴۶ء میں یہ انگریزی مضمون ڈان میں شائع ہوا۔[۴۱]

۶-The Crow Eaters کا تعارف

اقبال: بحیثیتِ باپ (۲۱/اپریل ۱۹۴۶ءکو لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔)[۴۲]

اقبال کا تصورِاجتہاد ۱۹۴۸ء (اسلامیہ کالج ہال میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھا۔)[۴۳]

اقبال کے مابعد الطبعیاتی تصور میں اخلاقیات کا مقام: ۱۹۴۸ء (بہت سے انگریزی اور اُردو اخبارات میں چھپا)۔[۴۴]

ادارت:[۴۵]

۱-اخبار نوائے اسلام

مطبوعات:

۱-مئے لالہ فام[۴۶]

''میرا یہ بھی معمول بن گیا تھا کہ ہر سال ۲۱/اپریل کو علامہ اقبال کے یوم وفات کے موقع پر لاہور میں یوم اقبال کی تقریب پر مقالہ پڑھتا۔مقالات کا یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک جاری رہا۔ (کتابی شکل میں یہ مقالات مئے لالہ فام کے نام سے ۱۹۶۶ءاور ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکے ہیں)''۔[۴۷]

۲-زندہ رُود (تین جلدیں)[۴۸]

۳-*The Stray Reflections* مرتبہ: جاوید اقبال[۴۹]

۴-یادیں مرتبہ تنویر ظہور(۵۰)

۵-میراثِ قائد اعظم(۵۱)

۶-*The Ideology of Pakistan & its implementation*(۵۲)

۷-اپنا گریباں چاک[خودنوشت سوانح]

۸-اسلام اور پاکستان کی شناخت (غیر مطبوعہ)

ڈاکٹر جاوید اقبال اس کتاب کے بارے میں اپنا گریباں چاک کے صفحات ۲۵۳-۲۵۴ پر لکھتے ہیں:

''۲۰۰۰ء کے ساتھ نئے 'ملینیم' اور نئی صدی کی ابتدا ہوئی۔ حالات کے پس منظر میں، میں نے سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا کہ بانیانِ پاکستان نے پاکستان کے لیے کس طرز کا اسلامی 'ماڈل' تجویز کر رکھا ہے؟ کیا انھیں ترکی، ایران، طالبان یا سعودی عرب کے اسلامی ماڈلوں میں سے کوئی ایک قابلِ قبول ہوسکتا تھا؟ یا ان کی نگاہ میں ان سب سے بہتر ان کا اپنا ماڈل تھا؟ ان کے ہاں قومیت، ریاست اور اقتدار کا کیا تصور تھا؟ اسلامیت سے وہ کیا مراد لیتے تھے؟ میں نے انھیں سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انگریزی میں ایک کتاب بعنوان اسلام اور پاکستان کی شناخت لکھنا شروع کی۔ دراصل یہ کتاب تو میں نے اسی دن سے لکھنا شروع کر دی تھی جب میاں نواز شریف نے شریعت بل کا اپنا ڈرافٹ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں پیش کیا تھا اور بعد ازاں میرا ڈرافٹ کردہ بل ناقابلِ قبول سمجھتے ہوئے شاید پھینک دیا گیا تھا۔ کتاب مکمل کرتے مجھے ڈیڑھ دو برس لگے۔ ویسے بھی سینٹ اور سیاست سے فراغت کے بعد اب میرے جیسا شخص تین ہی کام کر سکتا تھا یا پڑھتا چلا جائے یا لکھتا چلا جائے یا بولتا چلا جائے''۔

خطبات:(۵۳)ٹی وی پر دیے گئے مختلف موضوعات پر توسیعی خطبات

ڈاکٹر جاوید اقبال خودنوشت سوانح حیات اپنا گریباں چاک کے صفحہ ۲۲۷ پر لکھتے ہیں:

''جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ٹی وی والوں نے 'افکارِ اقبال' کے موضوع پر مجھ سے پندرہ سولہ لیکچر ریکارڈ کروائے تھے جو تقریباً سال بھر ٹیلی کاسٹ ہوتے رہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بیکار بیٹھنے کی بجائے ان لیکچروں کے نوٹس کی بنیاد پر ایک کتاب ہی کیوں نہ لکھ دوں۔ یہ کتاب بعنوان 'افکارِ اقبال' تشریحاتِ جاوید' سینٹ کے اجلاسوں کے دوران تحریر کی گئی جب کہ حزبِ

اقتدار اور حزبِ اختلاف کا دنگل جاری تھا''۔

مختلف مقامات پر دیے گئے خطبات کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱۔'جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال' زیر اہتمام اقبال اکادمی، کراچی: ۱۹۵۷ء[۵۴]

۲۔'حب الوطنی کے تقاضے اور ادیب' زیر اہتمام رائٹرز گلڈ، کراچی: ۱۹۵۸ء[۵۵]

۳۔'پاکستان میں اسلامی ریاست کی تلاش' زیر اہتمام کینبر یونی ورسٹی، آسٹریلیا: ۱۹۶۰ء[۵۶]

۴۔پاکستان، زیر اہتمام سڈنی یونی ورسٹی، آسٹریلیا: ۱۹۶۰ء[۵۷]

۵۔'پاکستان اور ترکی' زیر اہتمام شعبۂ ترکیات، انقرہ یونی ورسٹی، ترکی: ۱۹۶۰ء[۵۸]

۶۔'اقبال اور ترکی' زیر اہتمام شعبۂ ترکیات، استنبول یونی ورسٹی، ترکی[۵۹]

۷۔'اسلامی تمدن پر تین ماہ لیکچرز دیے' اپنا گریباں چاک کے صفحہ ۱۱۱ پر احوال یوں بیان کرتے ہیں:

''یو این نے میکسیکو کے لیے ایک خصوصی فنڈ مختص کر رکھا تھا جس کے تحت میکسیکو شہر میں ایک کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج میں تمام لاطینی امریکہ کی ریاستوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کی تحصیل کے لیے منتخب طلبا اور طالبات کی خاطر تین ماہ کا کورس متعین کیا گیا جو مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے مطالعہ کے بارے میں تھا۔ لیکچروں کے لیے طالب علموں کو دو زبانیں یعنی انگریزی اور فرانسیسی جاننا ضروری تھا۔ جن اہم شخصیات کو اپنے اپنے کلچر پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا گیا، ان میں گھانا کے معزول صدر نکروما، سوڈان کے معزول وزیر اعظم صادق المہدی، بھارت کے اشوکا مہتہ اور اسی طرح سوویت روس، یورپ اور برطانیہ کی بعض علمی شخصیات تھیں۔ تنخواہ بڑی معقول تھی اور ڈالروں میں ادا کی جاتی تھی۔ کورس جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۶۲ء کے تین ماہ پر مشتمل تھا۔ مجھے ''اسلامی تمدن'' کے موضوع پر لیکچر دینے کی ذمہ داری سونپی گئی جو میں نے قبول کر لی''۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے تین ماہ کے دورانیے میں پی ایچ ڈی کے طلبہ و طالبات کو حسبِ ذیل چھے پرچے پڑھائے:

دینِ اسلام کی تاریخ ارکان، عبادات اور معاملات میں تمیز (پہلا پرچہ)

قانونِ شریعت

جہاد اور قتال

اجتہاد کے استعمال کا مقصد (دوسرا پرچہ)

تاریخ اسلام (میثاق مدینہ سے ۱۹۲۴ء تک) (تیسرا پرچہ)

جدید دُنیائے اسلام (چوتھا پرچہ)

اسلام کا سیاسی فلسفہ، اخلاقیات، مابعد الطبعیات، فلسفہ وتصوف، آرٹ، فن تعمیر، ادب، موسیقی (پانچواں پرچہ)

اسلامی تمدن کے خصوصی اوصاف (چھٹا پرچہ)(۶۰)

۸- 'اسلامی تصوف' زیر اہتمام ساؤتھ ایشین سٹڈیز فیکلٹی، برکلے یونی ورسٹی، سان فرانسسکو: ۱۹۶۲ء(۶۱)

۹- 'پاکستان اور ایران' زیر اہتمام تہران یونی ورسٹی: ۱۹۶۲ء(۶۲)

۱۰- 'علامہ اقبال کے سیاسی فکر میں اسلامی اتحاد کی اہمیت' زیر اہتمام ڈاکٹر حفیظ ملک، بیلا جیوا اٹلی: ۱۹۷۵ء(۶۳)

۱۱- 'رومی کا تصور شیطان' زیر اہتمام حکومت ترکیہ: ۱۹۷۸ء(۶۴)

۱۲- 'اسلام کا تصور حاکمیت' زیر اہتمام کلیسا ہیوسٹن، ٹیکساس: ۱۹۸۱ء(۶۵)

۱۳- 'اسلام بحیثیتِ ایک قومیت ساز قوت' زیر اہتمام سالسبرگ، آسٹریلیا: ۱۹۸۳ء(۶۶)

۱۴- 'اسلامی ریاست' زیر اہتمام مسلم سوشل سائنٹسٹس، انڈیانا پولس، امریکہ: ۱۹۸۲ء(۶۷)

۱۵- 'پاکستان میں اسلامائزیشن' زیر اہتمام ویلانووا یونی ورسٹی، پان سلوانیا، امریکہ: ۱۹۸۴ء(۶۸)

۱۶- 'مذہبی عدم رواداری' زیر اہتمام اقوام متحدہ، جنیوا، سوئزرلینڈ: ۱۹۸۴ء(۶۹)

۱۷- فکرِ اقبال (تین لیکچر)، قاہرہ، عین الشمس اور الازہر یونی ورسٹیوں میں ایک ایک لیکچر: ۱۹۸۵ء(۷۰)

۱۸- 'اقبال کا تصور اتحاد اور تیسری دُنیا' زیر اہتمام تہران یونی ورسٹی، بین الاقوامی اقبال کانگرس: ۱۹۸۶ء(۷۱)

۱۹- 'اقبال اور علی شریعتی' زیر اہتمام علی شریعتی یونی ورسٹی، مشہد: ۱۹۸۶ء(۷۲)

۲۰-'جدید اسلامی ریاست' زیر اہتمام انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک سٹڈیز، استنبول یونی ورسٹی، ترکی: ۱۹۸۷ء[۷۳]

۲۱-'علامہ اقبال وکمال اتاترک' زیر اہتمام شعبۂ ترکیات، انقرہ یونی ورسٹی، انقرہ، ترکی: ۱۹۸۷ء[۷۴]

۲۲-'علامہ اقبال' زیر اہتمام پاکستانی سفارت خانہ دمشق، شام: ۱۹۸۷ء[۷۵]

۲۳-'فکرِ اقبال' اوسلو، ناروے میں مقیم پاکستانیوں کے زیر اہتمام یوم آزادی کے موقع پر: ۱۹۸۷ء[۷۶]

۲۴-''جدید اسلامی ریاست' زیر اہتمام ویلانووا یونی ورسٹی، امریکہ: ۱۹۸۸ء[۷۷]

۲۵-مونٹریال، کیلگری، وینکوور، ٹورنٹو یونی ورسٹیوں میں کینیڈین پاکستانی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام چار لیکچر دیے: ۱۹۸۸ء[۷۸]

۲۶-'فکرِ اقبال' زیر اہتمام فیض اکادمی، لندن (جشن اقبال): ۱۹۹۰ء[۷۹]

۲۷-'اقبال اور جناح کا تصور اسلامی ریاست' پاکستان تھنکر زفورم کے زیر اہتمام دبئی اور ابوظہبی میں پانچ لیکچر: ۱۹۹۱ء[۸۰]

۲۸-'پاکستان: ماضی، حال اور مستقبل' زیر اہتمام پاکستانی فورم، شکاگو، امریکہ: ۱۹۹۱ء[۸۱]

۲۹-'زبانوں نے اسلامی تمدن کے فروغ کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟' زیر اہتمام رائل اکادمی، اردن: ۱۹۹۱ء[۸۲]

۳۰-'پاکستان اور اسلامی لبرل تحریک' زیر اہتمام پروفیشنلز فورم، دبئی: ۱۹۹۳ء[۸۳]

۳۱-'اقبال اور اسلامی لبرل ازم' زیر اہتمام ہائیڈل برگ، یونی ورسٹی، جرمنی: ۱۹۹۳ء[۸۴]

۳۲-'انسان اور تمدن کے مستقبل کا اسلامی تصور' زیر اہتمام رائل اکادمی، عمان، اردن: ۱۹۹۳ء[۸۵]

۳۳-'نئے ورلڈ آرڈر میں چین اور روس کا مقام' زیر اہتمام ویلانووا یونی ورسٹی، پین سلوانیا، امریکہ: ۱۹۹۳ء[۸۶]

۳۴-'اسلامی جمہوریت اور عدل کا تصور' زیر اہتمام روس اکادمی آف سائنسز، ہوائی یونی ورسٹی، امریکہ: ۱۹۹۵ء[۸۷]

۳۵-'متحدہ ادیان' سان فرانسسکو، امریکہ: ۱۹۹۸ء[۸۸]

۳۶-'پاکستان میں عدالتی فعالیت' ہارورڈ لاسکول، امریکہ: ۱۹۹۸ء[۸۹]

۳۷-'اسلام میں عورتوں کے حقوق' ہیوسٹن ٹیکساس، امریکہ: ۱۹۹۸ء[۹۰]

۳۸-'سیّد جمال الدین افغانی اور تحریک احیائے اسلام' زیر اہتمام حکومت تہران، ایران: ۱۹۹۷ء[۹۱]

۳۹-'اقبال اور احیائے ایشیا' زیر اہتمام ملائشین حکومت، کوالالامپور، ملائشیا: ۱۹۹۷ء[۹۲]

۴۰-'عدلیہ کا کردار' زیر اہتمام ویلانووا یونی ورسٹی، امریکہ: ۱۹۹۷ء[۹۳]

۴۱-'اقبال اور لبرل اسلام' کے موضوع پر رفاہ پارٹی کے زیر اہتمام استنبول، انقرہ، قونیہ، ادانہ اور قیصریہ میں پانچ لیکچر دیے: ۱۹۹۷ء[۹۴]

۴۲-'تہذیبوں کا ٹکراؤ' کے موضوع پر رفاہ پارٹی کے زیر اہتمام استنبول اور دیارِ بکر، ترکی میں دو لیکچر دیے: ۱۹۹۷ء[۹۵]

۴۳-'فکرِ اقبال' کے موضوع پر این آربر یونی ورسٹی، ڈیٹرائیٹ، امریکہ میں چند لیکچر دیے: ۲۰۰۰ء[۹۶]

۴۴-'شیطان: رومی، گوئٹے اور اقبال کے نرغے میں' ترک حکومت کے زیر اہتمام انقرہ اور قونیہ، ترکی میں دو لیکچر: ۲۰۰۰ء[۹۷]

۴۵-'اقبال کا فلسفہ' زیر اہتمام بارسیلونا یونی ورسٹی، سپین: ۲۰۰۱ء[۹۸]

۴۶-'تہذیبوں کا ٹکراؤ' زیر اہتمام آل البیت اکادمی، عمان، اردن: ۲۰۰۲ء[۹۹]

۴۷-'اسلامی ریاست اور قومیت: اقبال کی نظر میں' زیر اہتمام علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، بہ سلسلۂ سال اقبال: ۲۰۰۲ء (ملاحظہ کریں کتابچہ تقریبات سال اقبال ۲۰۰۲ء: مطبوعہ ۲۰۰۳ء: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد)

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱- جاوید اقبال کی پیدائش پر ان کے دادا شیخ نور محمد نے ان کے کان میں اذان دی اور آفتاب اقبال کی مناسبت سے ان کا نام قمر الاسلام تجویز کیا' مگر اقبال نے قمر الاسلام کے بجائے جاوید اقبال نام رکھا۔ بقول سعشہ خان:

''یہ نام علامہ اقبال اور ڈاکٹر جاوید اقبال دونوں کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ جاوید نامہ اور جاوید سے منسوب نظموں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ان نظموں کے ذریعے علامہ اقبال نے 'نژادِ نو' کو عمل کا پیغام دیا اور سربلند ہونا سکھایا اور جاوید اقبال کو اس نام کی برکت سے علم کی فضیلت اور فلسفے کی گہرائی حاصل ہوئی۔'' (ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات: ص ۸)

۲- علامہ اقبال کو اولاد نرینہ کی بہت خواہش تھی۔ انھوں نے سرہند شریف میں مجدد الف ثانی کی بارگاہ پر حاضری دی اور دُعا کی کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایک فرزند عطا کرے۔ انھوں نے نذر مانی کہ اگر خدا نے مجھے اولاد نرینہ سے نوازا تو اسے ساتھ لے کر مزار پر حاضری دوں گا۔ جب جاوید اقبال ہوش مند ہوئے' تو علامہ انھیں لے کر مجدد صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے۔ جاوید اقبال نے اس حاضری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میں ان کے ساتھ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہو رہا ہوں۔ گنبد کے تیرہ و تار' مگر پُروقار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر رکھی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں اپنے چاروں طرف گھور رہا ہوں' جیسے میں اس مقام کی خاموش ویرانی سے کچھ کچھ شناسا ہوں۔ ابا جان نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر انھوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ منگوایا اور دیر تک پڑھتے رہے۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی آواز کی گونج ایک ہولناک ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ اُمڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔'' (منے لاله فام: ص ۶)

۳- اپنا گریباں چاك، ص ۱۱

۴- ایضاً، ص ۱۳

۵- ایضاً، ص ۲۳

۶- ایضاً، ص ۲۳

۷- ایضاً، ص ۴۷-۴۸

۸- ایضاً، ص ۴۹

۹- ایضاً، ص ۴۹

۱۰- ایضاً، ص ۵۱

۱۱- ایضاً،ص ۵۸

۱۲- ایضاً،ص ۶۱

۱۳- ایضاً،ص ۷۲

۱۴- ایضاً،ص ۷۶

۱۵،۱۶- : جاوید اقبال نے اپنے ان اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''میرے ایک ہندو استاد تھے' ماسٹر تارا چند' انھی سے میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ میری جو خوش خطی ہے' یہ بھی ماسٹر تارا چند کی وجہ سے تھی۔ وہ بہت خوش خط تھے۔ انھوں نے میرے ہاتھ پر بید مار مار کر مجھے خوش خطی سکھائی۔ ان ہی ماسٹر تارا چند کی وجہ سے ابتدائی مراحل میں کامیابی حاصل کر کے میں سنٹرل ماڈل سکول میں آیا۔ سنٹرل ماڈل سکول میں ماسٹر غلام ناصر خاں سے متاثر ہوا'' (یادیں: مرتبہ تنویر ظہور: لاہور' فضل حق سنز پبلشرز: ۱۹۹۰ء ص:۱۶)

۱۷- ''چودھری محمد حسین نے مجھے دیوان غالب پڑھایا۔ مسدس حالی پڑھائی' اس کے بعد علامہ اقبال کا کلام پڑھایا۔ میری جہاں تک اُردو ادب کے ساتھ نسبت ہے یہ سب کچھ چودھری محمد حسین کی بدولت ہے' جو ایک طرح سے میرے معلم بھی تھے اور ولی بھی تھے۔'' (یادیں:ص ۲۶)

۱۸- جاوید اقبال کو یورپ میں ان اساتذہ سے کسب فیض کا موقع ملا۔ یہ تمام اساتذہ اپنے اپنے فن کے امام تھے۔

۱۹- اپنا گریباں چاک،ص ۷۳

۲۰- ایضاً،ص ۷۵

۲۱- ایضاً،ص ۹۱۔

۲۲،۲۳- یورپ سے واپسی کے بعد جاوید اقبال نے وکالت کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ لا کالج میں پڑھانا بھی شروع کیا۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۰ء تک چودہ سال وہ تدریس سے وابستہ رہے۔ جج مقرر ہونے کے بعد لا کالج میں پڑھانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

۲۴- اپنا گریباں چاک،ص ۶۱

۲۵- ایضاً،ص ۲۰۲

۲۶- ایضاً،ص ۲۱۷

۲۷- ایضاً،ص ۱۲۲

۲۸- ناصرہ جاوید اقبال نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

''میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ میں بچپن سے ہی خاموش طبع لڑکی تھی۔ میرے بڑے بھائی اور مجھ میں عمر کا پانچ سال کا فرق تھا اور وہ ہاسٹل میں رہتے تھے۔ میں اکیلی ہونے کی وجہ سے ضدی بھی نہیں تھی بس آرام سے اچھے بچوں کی طرح سارا کام مکمل کرتی اور پڑھائی میں خود کو مصروف رکھتی' شرارتیں نہیں کیں۔ میرے والدین کے اندر فطری طور پر فلاحی کاموں سے خصوصی رغبت تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی'

والدہ بیگم سعیدہ وحید گھریلو امور کی انجام دہی کے علاوہ مستحقین کی مدد بھی کرتی رہتیں۔ انھوں نے کئی فلاحی ادارے چلائے۔ اپوا سمیت متعدد تعلیمی فلاحی اداروں کی ابتدا کی۔ میری دادی زچگی کے دوران فوت ہوگئیں تو والدہ نے ان کی یاد میں فاطمہ میموریل ہسپتال بنایا' جہاں غریبوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ دراصل میرے والدین ہی میرے لیے آئیڈیل ہیں۔ ان کی خوبیوں نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا۔ میرے دادا مولوی فیروز الدین برصغیر کے پہلے مسلمان پبلشر تھے جنھوں نے فیروز سنز جیسے معروف اشاعتی ادارے کی بنیاد رکھی۔ میرے والد ڈاکٹر وحید ماہر تعلیم تھے اور پشاور یونی ورسٹی میں بطور معلم خدمات انجام دینے کے علاوہ لیگ آف نیشنز میں بھی کام کرتے رہے۔ والدہ نے پاکستان میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے خاصی جدوجہد کی۔ وہ اپوا اور فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن جیسے اداروں کی بانی ہیں۔ میں نے کنیئرڈ کالج سے بی اے کے بعد ایم اے صحافت میں داخلہ لیا تو انھی دنوں میری شادی ہوگئی اور تعلیمی سلسلہ وقتی طور پر رک گیا۔'' (روز نامہ نوائے وقت: سنڈے میگزین، ۱۱رنومبر ۲۰۰۱ء:ص ۱۱)

جاوید اقبال نے تنویر ظہور کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا:

'' میری بیوی ناصرہ، ڈاکٹر عبدالوحید آف فیروز سنز کی بیٹی ہیں اور اُن سے میری پہلی مرتبہ ملاقات نیویارک میں ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی' کیوں کہ وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اپنے والد کے ساتھ یواین او آئی تھیں۔ ہمیں ایک دوسرے کو ملنے اور جاننے کے مواقع وہیں ملے۔ جب وہ لاہور واپس آئیں' تو ہماری شادی ہوگئی۔'' (یادیں:ص ۲۵)

ڈاکٹر جاوید اقبال پر اپنی تحقیقی کتاب میں سعشہ خان نے ناصرہ جاوید اقبال کے بارے میں لکھا ہے:

'' بیگم ناصرہ نے لا کالج لاہور سے ایل ایل ایم کیا اور پنجاب یونی ورسٹی میں خواتین میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں ہارورڈ کا سکالرشپ ملا۔ وہاں انھوں نے ایک ہی سال میں ایل ایل ایم کیا۔ اس سے ان کی ذہانت اور محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں ان کا تقرر بطور جج لاہور ہائی کورٹ میں ہوا۔'' (ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات :ص ۲۶-۲۷)

۲۹- اپنا گریباں چاک،ص ۱۳۵

۳۰- جاوید اقبال کے بڑے صاحبزادے منیب اقبال نے ولانووا کیتھولک یونی ورسٹی' امریکہ سے ایم اے پولٹیکل سائنس میں کیا' جب کہ چھوٹے بیٹے ولید اقبال نے کیمبرج یونی ورسٹی سے انٹرنیشنل اکنامکس میں ایم فل کیا۔

۳۱- اپنا گریباں چاک،ص ۱۳۵

۳۲- اپنا گریباں چاک،ص ۱۳۵

۳۳- جاوید اقبال نے پانچ افسانے لکھے' جو ادب لطیف' سویرا' اور نرگس بمبئی میں شائع ہوئے۔ 'بحران' فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے' جس کے بارے میں سعشہ خان نے لکھا ہے:

''۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں جس طرح انسان کی بے حرمتی کی گئی' اس کی پر تاثیر اور پر سوز تصویر اس افسانے میں دکھائی گئی ہے۔ یہ افسانہ اخبارات کے ان تراشوں سے ترتیب دیا گیا ہے' جن میں قتل و غارت کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ افسانے کا آغاز ایک ایسے منظر نامہ سے ہوتا ہے' جو انسان کے وحشی ہونے کی تصویر ذہن میں ابھارتا ہے۔ یہ افسانہ فنی اعتبار سے ایک اچھی تخلیق ہے اور موضوع کے اعتبار سے ایک تاریخی دستاویز بھی۔'' (ص:۳۲-۳۳)

۳۴- اپنا گریباں چاک،ص۵۲

۳۵- جاوید اقبال نے بیس کے قریب ڈرامے لکھے' جن میں تین ڈرامے ٹی وی کے لیے لکھے گئے' ان ڈراموں میں صدر ایوب کے سیاسی رویوں کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا' لیکن ان ڈراموں پر پابندی عائد ہوگئی۔

۳۶- اپنا گریباں چاک،ص۵۹

۳۷- ایضاً،ص۱۳۰

۳۸- جاوید اقبال نے دوخا کے لکھے' یہ دونوں خاکے ان کی کتاب مئے لالہ فام میں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں۔

۳۹- جاوید اقبال نے ارسطو کے تصور المیہ' پر نہایت ہی عالمانہ مضمون لکھا۔ انھوں نے ڈرامے کے المیہ عناصر کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

''المیہ تمثیل انسانیت میں ایک ابدی وحدت کا تصور پیش کرتی ہے۔ المیہ تقدیر کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی درپردہ خواہش ہے۔'' (۱۹۴۸ء کا بہترین ادب: میرزا ادیب (مرتب): مکتبہ اُردو: لاہور:۱۹۴۹ء'ص:۸۰)

''نصب العین کا مسئلہ'' دراصل ان کا ایک سلسلہ مضامین ہے' جو روز نامہ ''امروز'' میں احمد ندیم قاسمی کے جواب میں لکھے گئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''میرے اور احمد ندیم قاسمی کے درمیان ''نصب العین کے مسئلے'' کے موضوع پر ایک ادبی تنازع اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سلسلے میں ہم دونوں کی طرف سے مضمون اور جواب مضمون لکھے گئے' جو مولانا چراغ حسن حسرت نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیے۔ ترقی پسندوں کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم محض جغرافیائی ہے' لیکن تمدنی اور ادبی طور پر ہم ایک ہیں۔ میرا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم جغرافیائی نہیں' بل کہ تمدنی امتیاز کی بنا پر ہوئی ہے' اس لیے اب ہمیں پاکستانی ادب تخلیق کرنا چاہیے۔'' (یادیں:ص۱۵۰)

۴۰- اپنا گریباں چاک،ص۵۷

۴۱- ایضاً،ص۵۷

۴۲- ایضاً،ص۶۶

۴۳- ایضاً،ص۶۶

۴۴- 'The Problem of Morality in Developing Societies'. کے عنوان سے مضمون 'Quest for

'Truth' میں شائع ہوا۔ یہ کتاب پاکستان فلاسفیکل کانگریس لاہور کے اہتمام سے چھپی۔
'The Crow Eater' کے عنوان سے 'Bapsi Sidhwa' نامی خاتون نے ۱۹۶۸ء میں ایک ناول لکھا، جس کا تعارف ڈاکٹر جاوید اقبال نے تحریر کیا۔

۴۵- سعشہ خان لکھتی ہیں:

'قیام پاکستان سے قبل ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے ہم خیال ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک زمین دوز اخبار نوائے اسلام نکالا' جو کچھ عرصہ تک ڈاکٹر جاوید اقبال کے گھر ہی میں ترتیب دیا جاتا رہا۔''
(ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات :ص۶۷)

۴۶- مئے لالہ فام کے عنوان سے فکرِ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر جاوید اقبال کا تنقیدی مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۶ء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور کے زیر اہتمام چھپا' اس میں دس مقالے شامل تھے۔ بار دگر ۱۹۷۲ء میں سات مقالات کے اضافے کے ساتھ اس کا ایڈیشن چھپا' گویا اب اس میں سترہ مقالے شامل اشاعت ہیں، دوسری اشاعت کے مطابق پونے چار سو صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱- جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال
۲- فکرِ اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کا جائزہ
۳- اقبال اور اسلامی ریاست
۴- اقبال اور اُن کے زمانے کی مسلم سیاسی جماعتیں
۵- اقبال' پاکستانی قوم پرستی اور بین الاقوامی اسلام
۶- اقبال کے شذرات
۷- اقبال اور پاکستان کے محمود و ایاز
۸- اقبال بحیثیتِ شاعر انقلاب
۹- اقبال اور قومی کردار
۱۰- اقبال اور شیطان (۱)
۱۱- اقبال اور شیطان (۲)
۱۲- اقبال اور گردش ایام
۱۳- اقبال اور نژادِ نو
۱۴- اقبال اور ندرت فکر
۱۵- خطبۂ صدارت
۱۶- اقبال کے معاشی تصورات
۱۷- اقبال اور امید بہار

اس مجموعۂ مضامین کے آخر میں ضمیمے کے طور پر جاوید اقبال کے تحریر کردہ دو خاکے بھی شامل ہیں:

۱- اقبال: ایک باپ کی حیثیت سے

۲- چودھری محمد حسین

بعد ازاں اقبال اکادمی کے زیر اہتمام ۱۹۹۶ء میں تیسرا ایڈیشن اشاعت پذیر ہوا، جس میں فکریات، پاکستانیات، سیاسیات اور شخصیات واماکن کے عنوانات کے تحت ۲۷ مقالات، مضامین اور خاکے شامل ہیں۔ یہ کتاب ۳۵۷ صفحات کو محیط ہے۔ چوں کہ اس کا مواد کمپیوٹر کتابت پر مشتمل ہے اس لیے صفحات کم بنتے ہیں۔ مشمولات کی فہرست ملاحظہ کیجیے:

۱۔ پیش لفظ

فکریات

۲۔ جدید اسلام میں لبرل ازم کی تحریک اور اقبال

۳۔ اقبال بحیثیتِ شاعر انقلاب

۴۔ اقبال اور ندرت فکر

۵۔ اقبال اور مسئلہ تعلیم جدید

۶۔ اقبال اور گردش ایام

۷۔ اقبال اور نژادِ نو

۸۔ اقبال اور نظریاتی بحران

۹۔ اقبال کے معاشی تصورات

۱۰۔ اقبال اور امید بہار

۱۱۔ اقبال اور قومی کردار

۱۲۔ شریعت اسلامیہ اور علامہ اقبال

۱۳۔ اقبال اور شیطان۔۱

۱۴۔ اقبال اور شیطان۔۲

۱۵۔ اقبال کے شذرات

پاکستانیات

۱۶۔ فکرِ اقبال کی روشنی میں پاکستان کی سیاسیات حاضرہ کا جائزہ

۱۷۔ اقبال، پاکستانی قوم پرستی اور بین الاقوامی اسلام

۱۸۔ اقبال اور پاکستان کے محمود و ایاز

۱۹۔ پاکستان کی نظریاتی اساس اور اسلامی قانون سازی

سیاسیات

۲۰۔اقبال اور اسلامی ریاست
۲۱۔اقبال اور اُن کے زمانے کی مسلم سیاسی جماعتیں
۲۲۔علامہ اقبال کا تصور جمہوریت اور موجودہ صورت حال
۲۳۔علامہ اقبال اور جمہوریت
شخصیات و اماکن
۲۴۔چودھری محمد حسین
۲۵۔اقبال۔ایک باپ کی حیثیت سے
۲۶۔مرکزیہ مجلس اقبال اور صدر محمد ضیاء الحق
۲۷۔کشمیر۔اقبال کی نظر میں

۴۷- اپنا گریباں چاک،ص ۹۸

۴۸- زندہ رُود علامہ اقبال کی سوانح عمری ہے' جو تین جلدوں میں شیخ غلام علی اینڈ سنز کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔اکیس ابواب پر مشتمل یہ کتاب اقبال کی ذہنی اور فکری سرگزشت ہے۔اس سوانح عمری کا پانچ سے زائد زبانوں میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۴۹- 'The Stray Reflections' ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی علامہ اقبال کی ڈائری کے وہ اوراق ہیں' جنھیں جاوید اقبال نے ۱۹۶۱ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔اسی کتاب پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا' لیکن اس کتاب کی اشاعت اہلِ علم کے ایک مخصوص طبقے تک محدود رہی۔اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر مجلس ترقیِ ادب' لاہور نے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی سے اس کا اُردو ترجمہ کرا کے شائع کیا۔

۵۰- ۱۹۹۰ء میں تنویر ظہور نے روز نامہ جنگ لاہور کے جمعہ ایڈیشن کے لیے ڈاکٹر جاوید اقبال کا ایک تفصیلی انٹرویو کیا جو کئی قسطوں میں شائع ہوا اور بعد میں یادیں کے عنوان سے اسے کتابی صورت میں ترتیب دیا گیا۔انٹرویو کو کتابی صورت دیتے وقت تنویر ظہور نے مئے لالہ فام کے دیباچے اور اقبال ایک باپ کی حیثیت سے' کو بھی شامل کتاب کر دیا۔یوں یہ کتاب ان خصوصیات اور کوائف کا مرقع بن گئی' جو ایک اچھی سوانح عمری کا اختصاص بتائی جاتی ہیں۔ڈاکٹر جاوید اقبال نے یادیں کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''میں نے مختصراً اپنی ان یادداشتوں کو جمع کیا' جو علامہ اقبال' پاکستان اور پاکستان کی بعض اہم سیاسی شخصیات کے حوالے سے مرتب ہوئیں۔''(یادیں:ص ۷)

۵۱- ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۱۹۶۷ء میں قائداعظم کے حوالے سے ایک مختصر' مگر نہایت ہی معنی خیز کتاب اُردو اور انگریزی زبانوں میں تحریر کی۔سعشہ خان اپنی تحقیقی کتاب میں میراثِ قائداعظم کی وجہ تالیف پر گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'' فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے آخری برسوں میں ایسے مضمون شائع ہوئے، جن میں بالواسطہ یا بلاواسطہ قائداعظم محمد علی جناح کو سیکولر ریاست کا حامی قرار دیا گیا یا انھیں آمر کے خطاب سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس منفی رجحان کے خاتمے کے لیے قائداعظم کی تقاریر کے اقتباسات سے یہ ثابت کیا کہ وہ جمہوریت کے علم بردار تھے اور اُن کے فکر کی اساس قرآن پاک کے احکام پر تھی۔ 'میراث قائداعظم' میں قائداعظم کی تقاریر کو بنیاد بنایا گیا ہے' لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال نے قرآن مجید، صحیح بخاری، مؤطا امام مالك، کتاب الخراج از امام ابویوسف، احکام السطانیه از قاضی ابن ابی یعلی بن الفره، مقدمه ابن خلدون اور تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ از محمد اقبال کا بھی مطالعہ کیا۔'' (ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات :ص۲۴۰)

۵۲- ڈاکٹر جاوید اقبال کی یہ انگریزی کی کتاب ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی جو دراصل ایوب خاں کے ایک سوال نامے کے جوابات کو محیط تھی اور اسے ایوب خاں نے پسند کرتے ہوئے شائع کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی صدر ایوب خاں نے لکھا تھا۔ یہ چھے مقالات کا مجموعہ ہے' جن کی تفصیل یہ ہے:

1. Islam as a Vital organ of the state.
2. The Duties of the State and those of the Individual to the State.
3. Fundamental Rights.
4. The Realization of the Ideal of Solidarity.
5. Ideal Citizen.
6. Pakistan, Hinduism and Communism.

جسٹس جاوید اقبال کی اس کتاب کے جواب میں جسٹس منیر نے *From Jinnah To Zia* کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ وہ بتاتے ہیں:

''میں نے اپنی کتاب میں منیر انکوائری رپورٹ کا تجزیہ کیا تھا جس میں جسٹس منیر نے یہ کہا تھا کہ جملہ علمائے اسلام لفظ 'مسلمان' کی تعریف کر سکتے ہیں' نہ کسی ایک تعریف پر اتفاق کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی رپورٹ کی تیاری میں اکابر علما کو باقاعدہ xmine کیا تھا۔ ان ثقہ علما میں محترم مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ رپورٹ کی Finding یہ تھی کہ 'مسلم کی اصطلاح' ناقابلِ تعریف اور مبہم ہے۔ میں نے اپنی کتاب آئیڈیالوجی آف پاکستان میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ منیر انکوائری رپورٹ مرتب کرنے والے جج مغربی تعلیم یافتہ ہیں اور اُن کی عدالتی تربیت 'اینگلو سیکسن' طرز پر ہوئی ہے، جنھیں مذہب سے متعلق سوال اٹھانے کا کوئی حق نہ تھا' کیوں کہ ان کی تربیت میں مذہب کا کوئی دخل تھا اور نہ ان کا مذہب سے اس پہلو سے کوئی واسطہ رہا۔ چناں چہ انھوں نے علماءِ کرام کے لیے سوال بھی اس طرح فریم کیا کہ جیسے وہ جج خود مسلمان نہ ہوں' بل کہ کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ منیر رپورٹ کو میں نے براہ راست نظریۂ پاکستان پر حملہ قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ کا لازمی نتیجہ یہ سامنے آتا تھا کہ جب مسلم ہی ایک سوالیہ نشان ہے تو پھر 'مسلم قومیت' اور 'پاکستان' کے کیا معنی؟

اور بعد میں عملاً یہ نتیجہ مرتب بھی ہوا کہ منیر رپورٹ کو مغربی ممالک میں یہودیوں نے ہمارے خلاف استعمال کیا۔ اب آ کر جسٹس منیر نے میری کتاب آئیڈیالوجی آف پاکستان کا جواب اپنی کتاب فرام جناح ٹو ضیاء میں پیش کیا ہے، جس میں منجملہ دیگر باتوں کے انھوں نے مولانا محترم پر پاکستان کی مخالفت کا الزام عائد کیا ہے اور اُن کی دینی حیثیت کو بہ شمول دیگر علما کے یہ کہہ کر چیلنج کیا ہے کہ 'ہم اسلام اور اسلامی قانون کو سمجھتے تھے' ابہام علما کے ذہن میں تھا اور ہماری Finding علما کی نااہلی کا نتیجہ ہے'۔ اپنی حالیہ کتاب میں جسٹس منیر نے مولانا محترم پر جو بھی الزامات عائد کیے تھے وہ ان کے ماضی کے حوالے سے ہیں۔ اس نے اس بات پر اظہار تعجب کیا ہے کہ جو لوگ پاکستان کے مخالف تھے، آج اتفاق دیکھئے کہ پاکستان کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں ہے (اشارہ قومی اتحاد کی عبوری حکومت کی طرف ہے جو اگست ۱۹۷۸ء سے اپریل ۱۹۷۹ء تک قائم رہی اور جس میں جماعت اسلامی بھی پی این اے کا حصہ ہونے کی حیثیت سے شامل تھی)۔ اس منطق کے خلاف میرا عقیدہ ہے کہ اگر مولانا محترم دو قومی نظریہ جو تحریک پاکستان کی بنیاد تھا کی زبردست تائید وحمایت کے باوجود' مسلم لیگ کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کے باعث پاکستان کے مخالف قرار دیے جاتے ہیں' تو پھر بھی انھوں نے قیام پاکستان کے بعد اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ پھر یہی نہیں' بل کہ ملک کے وجود میں آنے کے بعد مولانا محترم نے بالخصوص مقاصد پاکستان کے حصول کی جنگ لڑی اور دن رات کام کیا۔ اب ان کی اس ساری محنت اور جانفشانی کو یہ کہہ کر ہوا نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا اس مرحلے پر میں ایک اور سوال بھی کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن سر ظفر اللہ خان تھا، جو مذہباً قادیانی بھی تھا۔ پھر اسے قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی پہلی کابینہ میں کیوں شامل کیا گیا؟ اسی طرح منظور قادر کی طرف سے پاکستان کی مخالفت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں' مگر وہ بھی ایوب حکومت میں وزارت کے مزے لوٹتے رہے۔ میرے نزدیک 'مخالف پاکستان' کل بھی وہی تھا اور آج بھی وہی ہے جو ملت کو ٹکڑوں میں بانٹتا ہے۔ مولانا محترم کل بھی قومی یک جہتی اور ملی وحدت کے داعی تھے اور آج بھی ان کے افکار اسی خوشبو سے معطر ہیں۔'' (ہفت روزہ زندگی' لاہور: ۲۶/اکتوبر تا یکم نومبر ۱۹۷۹ء: ص ۷۔۸)

۵۳- ڈاکٹر جاوید اقبال نے مختلف مواقع پر متعدد یونی ورسٹیوں' علمی اداروں اور پاکستان ٹیلی ویژن پر توسیعی خطبات دیے۔

۸۹۔۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''جہانِ اقبال'' کے عنوان سے ٹی وی پر پندرہ خطبے دیے۔ ان خطبوں میں انھوں نے اقبال کے فلسفۂ خودی کو مختلف حوالوں اور توجیحات کے ذریعے ناظرین تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔

۵/اگست ۱۹۹۰ء کو ڈاکٹر جاوید اقبال کا ایک توسیعی خطبہ 'پاکستان کی نظریاتی اساس' کے عنوان سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو 'فارابی کا تصور ریاست' کے عنوان سے ٹی وی پر ایک توسیعی خطبہ دیا۔
جنوری ۱۹۹۱ء میں ایک توسیعی خطبہ 'اسلام میں تصور ریاست' کے عنوان سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔
اگر یہ تمام خطبات کتابی صورت میں متشکل' ہوں تو ڈاکٹر جاوید اقبال کے افکار کی ایک نئی جہت سامنے آ سکتی ہے۔

۵۴- اپنا گریباں چاك،ص۹۲
۵۵- ایضاً،ص ۹۵
۵۶- ایضاً،ص ۹۹
۵۷- ایضاً،ص ۱۰۰
۵۸- ایضاً،ص ۱۰۲
۵۹- ایضاً،ص ۱۰۲
۶۰- ایضاً،ص ۱۱۶
۶۱- ایضاً،ص ۱۵۶
۶۲- ایضاً،ص ۱۵۶
۶۳- ایضاً،ص ۱۵۷
۶۴- ایضاً،ص ۱۷۶
۶۵- ایضاً،ص ۱۹۵۷
۶۶- ایضاً،ص ۱۸۷
۶۷- ایضاً،ص ۱۷۷
۶۸- ایضاً،ص ۱۹۱
۶۹- ایضاً،ص ۱۹۱
۷۰- ایضاً،ص ۱۹۳
۷۱- ایضاً،ص ۱۹۳
۷۲- ایضاً،ص ۱۹۱
۷۳- ایضاً،ص ۱۹۹
۷۴- ایضاً،ص ۱۹۹
۷۵- ایضاً،ص ۱۹۸
۷۶- ایضاً،ص ۲۰۰
۷۷- ایضاً،ص ۲۰۱
۷۸- ایضاً،ص ۲۰۲

۷۹- ایضاً، ص ۲۱۹
۸۰- ایضاً، ص ۲۱۹
۸۱- ایضاً، ص ۲۱۹
۸۲- ایضاً، ص ۲۱۹
۸۳- ایضاً، ص ۲۲۴
۸۴- ایضاً، ص ۲۲۴
۸۵- ایضاً، ص ۲۲۴
۸۶- ایضاً، ص ۲۲۵
۸۷- ایضاً، ص ۲۲۸
۸۸- ایضاً، ص ۲۲۹
۸۹- ایضاً، ص ۲۲۹
۹۰- ایضاً، ص ۲۳۰
۱۹- ایضاً، ص ۲۳۶-۲۳۵
۹۲- ایضاً، ص ۲۳۶
۹۳- ایضاً، ص ۲۳۶
۹۴- ایضاً، ص ۲۴۰
۹۵- ایضاً، ص ۲۴۰
۹۶- ایضاً، ص ۲۵۴
۹۷- ایضاً، ص ۲۵۴
۹۸- ایضاً، ص ۲۶۳
۹۹- ایضاً، ص ۲۷۰

☆☆☆☆☆

زندہ رُود

تعارفی جائزہ

زندہ رُود ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال کی تصنیفی اور تالیفی زندگی کا اہم تر سرمایہ ہے۔ انھوں نے اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس بے حد اہم موضوع پر لکھنے کا کام شروع کیا تو مشکلات ان کے راستے میں مسلسل حائل ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا کمال یہ ہے کہ اس خالص تحقیقی کام کی انجام دہی میں انتہائی ذمہ دارانہ رویّے کا مظاہرہ کیا۔ زندہ رُود کے بارے میں نام ور نقاد پروفیسر اُسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال کے ذاتی حالات کے سلسلے میں بہت سی سوانح عمریاں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن ہمارے طریقۂ کار کی ایک مشترک خامی ان سب میں کم وبیش کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم بالعموم نہ متعلقہ مواد کی پوری طرح جانچ پڑتال اور چھان بین کرتے ہیں اور نہ معروضی انداز میں اپنی تحقیق وتفتیش کے نتائج کو پیش کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں، بل کہ اس عمل میں اپنے تعصّبات اور تاثرات کو بیش از بیش دخیل ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جاوید اقبال کی زندہ رُود اس معاملے میں ایک استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔''(۱)

اگرچہ انھوں نے اس سے قبل علامہ کے فکر وفن پر کچھ مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کی کتاب مئے لالہ فام میں شائع ہوئے۔ زندہ رُود کی اشاعت تک علامہ کے فکر وفن کے متعلق سینکڑوں کتابیں منصۂ شہود پر آ ئیں، مگر چند ایک کے سوا باقی کی حیثیت رطب و یابس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس طرح علامہ کے سوانح، احوال و آثار پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں مگر پھر بھی ایک ایسی کتاب کی ضرورت باقی رہی، جسے احوال و آثار کے سلسلے میں آخری کارنامہ قرار دیا جاسکے۔ بہت سے اقبال شناسوں نے انفرادی طور پر علامہ کے سوانحی حالات اور واقعات کو

کتابی صورت میں مدون کیا اور بہت سوں سے یہ کام اقبالیاتی اداروں نے اقبال صدی کے موقع پر کرایا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال صدی تک شائع ہونے والی سوانحی کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی اس پائے کی نہیں ہے کہ جسے ہم اعتماد کے ساتھ پیش کر سکیں۔ علامہ نہ صرف مصور پاکستان اور شاعر پاکستان ہیں بل کہ ان کی حیثیت ایک ایسے تہذیبی استعارے کی ہے جس سے گم کردہ منزل نہ صرف اپنے ہونے کا ثبوت پاتے ہیں بل کہ فکری مغالطّوں میں گم کارواں اپنی تہذیبی اور مذہبی شناخت سے متعارف ہو سکتے ہیں۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک طویل عرصے تک ہم اپنے اس عظیم شاعر اور مفکر کے مستند احوال و آثار سے بے خبر رہے اور کسی حد تک اب بھی ایسے ہی واقعاتی مغالطّوں کا شکار ہیں۔ اقبالی مجالس کے حاضر باش، اقبال کے سوانحی احوال و آثار پر اچھا کام کر سکتے تھے مگر انھوں نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ وہ اقبال کے فکر وفن کی تعبیر و تفہیم کے کام تک محدود رہے' اور جن لوگوں نے احوال و آثار کے حوالے سے قلم اٹھایا وہ بھی ذاتی اور شخصی نوعیت کے بکھیڑوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ حیرت ہے کہ مولانا غلام رسول مہر جیسے محقق نے اپنے آپ کو کلیاتِ اقبال کی تشریح و توضیح تک محدود رکھا' حالاں کہ وہ اپنی زندگی کے کئی سال علامہ کی محافل میں باریاب رہے۔ انھیں چاہیے تھا کہ وہ ماہ وسال کے تعین کے ساتھ اقبالی آثار کو دُنیائے اقبال کے سامنے پیش کرتے۔ اسی طرح مولانا عبدالمجید سالک اقبال کے عزیز دوستوں میں سے تھے' انھوں نے سوانحی حوالے سے ایک کتاب تو مرتب کی مگر اس میں بھی ان کا صحافتی انداز بیان نمایاں رہا' ان بزرگوں کے علاوہ اقبالی محافل کے دیگر حاضر باش یا تو ملفوظات اکٹھے کرتے رہے یا پھر انھوں نے اقبال کے خطوں میں تراش خراش کا کام جاری رکھا۔

اقبال صدی تک شائع ہونے والے سوانحی ادب کی مایوس کن فضا کے بعد زندہ رُود کی حیثیت باد بہاری کے اس جھونکے کی تھی جو مشام جاں کو معطر کر دیتا ہے۔ یہ کتاب ابتدا میں تین حصوں میں شائع ہوئی، بعدہٗ یہ حصے ایک جلد میں بھی متشکل ہوئے۔ بہ قول سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن:

''یہ تینوں جلدیں لکھ کر اس کے مصنف نے دل فطرت شناس کا ثبوت دیا ہے اور اپنے والد بزرگوار کی زندگی کے سکوت لالہ وگل سے ہم کلام ہو کر اوران کے خیالات کی شاخ تاک اور

اُن کے افکار کی غزل کے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر دیا ہے۔ علامہ کے حالات بہت کچھ لکھے جا چکے ہیں' اور اُن کے شاعرانہ کمالات اور افکار کا تجزیہ بھی برابر ہو رہا ہے اور آئندہ بھی طرح طرح کے زاویوں سے ہوتا رہے گا' لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال کی زندہ رُود کی تینوں جلدوں کو منفرد حیثیت برابر اس لحاظ سے حاصل ہوتی رہے گی کہ ان میں علامہ کی جو صبح و شام نظر آتی ہے' یا ان میں ان کے افکار کی صبوحی تحریر کے بلوریں جام میں جس طرح چھلکتی دکھائی دیتی ہے کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔''(۲)

اقبال کے سوانحی ادب میں اس کتاب کا جو مقام و مرتبہ ہے وہ صاحبان خبر و نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی داد و تحسین کا ایسا غلغلہ مچا کہ کان پڑی کوئی آواز حیطۂ سماعت کو متاثر نہ کر سکی۔ محبت و عقیدت کے حصار میں داد و دہش کا جو سلسلہ چل نکلا، اس میں کتاب کی تمام تر خامیاں اور تسامحات دب کر رہ گئے۔ بہ قول سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن:

''پہلی اور دوسری جلدوں کی طرح اس (تیسری جلد) کی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی مثنوی پڑھ رہے ہیں جس میں اس کا ہیرو کبھی سیاست کے میدان عمل میں دکھائی دیتا ہے، کبھی بچوں کا شفیق باپ نظر آتا ہے اور کبھی اس کا دل کون و مکاں کے راز مضمر کو فاش کر کے ایک ابدی پیام چھوڑنے کے لیے متفکر ہے۔ ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے میں لائق مصنف نے کبھی اپنی بذلہ سنجی' کبھی طرز ادا کی خوش سلیقگی' کبھی تحریر کی شگفتگی کا وہی رنگ اختیار کیا جو ان کے والد بزرگوار نے اپنے متعلق کہا تھا۔

کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ''(۳)

حقیقت یہ ہے کہ کتاب اپنی تمام تر کوتاہیوں اور مغالطوں کے باوجود اقبال کے سوانحی ادب میں اہم تر مقام کی حامل ہے۔ ۱۹۷۷ء تک شائع شدہ احوال و آثار پر مبنی کتب کے تناظر میں تو یقیناً اسے ایک بلند مرتبہ حاصل ہے مگر اقبال کی تشکیلی' وسطی اور تکمیلی زندگی کے تمام تر حالات و واقعات کے پس منظر میں اسے حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا اور اب بھی ایک ایسی کتاب کی ضرورت موجود ہے جو چاہے کئی جلدوں پر مشتمل ہو مگر اس میں اقبال کی زندگی' عہد' علمی اور ادبی فضا' سیاسی و فکری احوال کا مکمل اور مبسوط ذکر موجود ہو۔ بہ قول سعشہ خان:

''ڈاکٹر جاوید اقبال کی سوانح اقبال پر مشتمل زندہ رُود (تین جلدوں میں) نہ صرف اُردو کی

سوانح عمریوں میں ایک قیمتی اضافہ ہے بل کہ اقبال کی مکمل، مبسوط سوانح عمری کا پہلا اور اس وقت تک کا آخری نمونہ بھی ہے جو اقبال شناسی کے کئی در کھولتی ہے۔ بے شک زندہ رُود سے پہلے بھی اقبال کی شخصیت، شاعری اور فکر پر لاتعداد مقالے، مضامین اور کتابیں لکھی گئیں اور سوانح اقبال سے متعلق، متفرق مضامین اور متعدد، باقاعدہ کتابیں معرض تحریر میں آ چکی تھیں۔ بوجوہ یہ سارا سوانحی مواد تنقیح وتفحص کا متقاضی ہے، گویا مجموعی طور پر اس مواد کا پایۂ استناد محلِ نظر ہے۔ خصوصاً اقبال کی مستقل سوانح عمریاں بھی مواد اور فنی ترتیب وتکمیل کے نقطۂ نظر سے قابلِ توجہ ہیں..... ان کے مقابلے میں زندہ رُود میں پختہ فنی شعور کا احساس ہوتا ہے کیوں کہ اس میں سوانح نگاری کے فن کے اُصول اور شرائط ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اس میں خصوصاً ترتیب وتنظیم کا احساس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ زندہ رُود عجلت میں قلم بند نہیں کی گئی۔

زندہ رُود میں اقبال کی شخصی زندگی کے نہ صرف واقعات جمع ہو گئے ہیں بل کہ جاوید اقبال نے ان محرکات کی تفصیل بھی درج کی ہے۔ جنھوں نے اقبال کو ایک بلند مفکر بنایا۔ اس طرح زندہ رُود میں ہمیں اقبال کے جسمانی اور ذہنی سفر کی مکمل داستان ملتی ہے۔''(۴)

-۲-

زندہ رُود تین جلدوں پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ تشکیلی (۵)

۲۔ وسطی (۶)

۳۔ اختتامی (۷)

بعد میں زندہ رُود ۱۹۸۹ء میں ایک جلد میں شائع ہوئی۔ اس کا ایک انڈین ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ ڈاکٹر شاہین دخت صفیاری نے زندہ رُود کا فارسی ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ایران سے اشاعت پذیر ہوا تو زندہ رُود کی شہرت اُردو دُنیا سے نکل کر دُنیائے فارسی تک پھیل گئی اور یوں یہ کتاب پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ ایران کے علمی اور ادبی حلقوں میں بھی معروف ہوئی۔ اقبالیاتی ادب کے سالانہ جائزوں میں اس کا بھی ذکر ہوا۔ چوں کہ یہ کتاب اقبال کے سوانحی ادب میں

اپنے بعض تحقیقی حوالوں کی وجہ سے نمایاں اور ممتاز ہے۔ اس لیے اس کی تحسین و تائید کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ویسے بھی چوں کہ کوئی دوسری سوانحی کتاب کم از کم زندہ رُود کے تحقیقی اور تجزیاتی ہدف کو نہیں پہنچتی، اس لیے بھی اس کی اہمیت کا جواز موجود ہے۔

-۳-

ڈاکٹر جسٹس (ر) جاوید اقبال' علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ہیں۔ انھوں نے زندہ رُود کے سلسلے میں جن کتابوں کو اپنی تحقیق اور تنقید کی بنیاد بنایا' ان میں سے اکثر و بیشتر ثانوی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علامہ کے خطوط، جنھیں بنیادی اور اولین مآخذ کی حیثیت حاصل ہے، سے بہت کم استناد کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے خطوط کے غائر مطالعے کے بعد دو چیزیں خاص طور پر نمایاں ہوتی ہیں:

(ا) علامہ کے خطوط میں ان کی زندگی کے سوانحی اشارات بہ کثرت موجود ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مواد ان کے خطوط سے اخذ کیا جاتا' تاکہ اقبال کے سوانحی رویوں کو بہتر اور مستند تناظر میں دیکھا جا سکتا۔

(ب) علامہ نے اپنے خطوط میں اپنے افکار و نظریات کی تشریح و توضیح بھی کی ہے اور اپنی فکری زندگی کے مجموعی پس منظر میں اپنے عہد کے علمی، فکری' معاشرتی ' سماجی اور مذہبی معاملات اور مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کا عندیہ بھی دیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ کی زندگی کے مختلف ادوار کی تشکیل اور ترتیب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے خطوط کے ان داخلی شواہد سے استفادہ نہیں کیا۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زندہ رُود اپنے ثانوی مآخذ و مصادر کی وجہ سے تحقیق کے ان مسلمہ اُصولوں پر پوری نہیں اترتی جو علمائے تحقیق نے محققین کے لیے مرتب کیے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ زندہ رُود میں زبان و بیان اور قواعد و املا کی غلطیوں نے اس کے مجموعی تاثر کو ابھرنے نہیں دیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی نثر سادہ' سلیس اور سائنسی بنیادوں پر استوار ہے مگر اس میں فنی اور تحقیقی پختگی اور مشاقی کا عنصر کم سے کم ہے۔ اقبال کے سوانحی ادب پر لکھتے

ہوئے ضروری تھا کہ پیش نظر شخصیت کے مقام و مرتبے کے مطابق زبان و بیان کا انداز اور آہنگ معیاری اور معتبر ہوتا' مگر ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ پھر یہ بھی کہ فرزند اقبال ہونے کے ناتے انھیں جن آثار اور مآخذ تک رسائی حاصل تھی یا رہی' کوئی دوسرا اقبال شناس اس سے فیض یاب نہیں ہوسکا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ اتنے بنیادی مصادر تک رسائی رکھنے کے باوجود ان کے اس تحقیقی کام میں اولین مآخذ کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ان کی تمام کتابیات کو دیکھ جایئے اور پھر ان کتب کی متن میں اطلاقی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے کتاب کے جن حصوں سے اقتباسات نقل کیے ہیں، ان کے آس پاس کچھ ایسا مواد بھی موجود ہے کہ جسے استعمال کر کے اپنے بعض تسامحات کو ختم کیا جاسکتا تھا' مگر انھوں نے اس جانب توجہ مبذول نہیں کی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ علامہ کی سال بہ سال علمی اور فکری پیش رفت کا ایسا خاکہ مرتب ہوتا، جس میں علامہ کی زندگی کے معلوم پہلوؤں کی تمام تر جزئیات اکٹھی ہو کر سامنے آجاتیں' مگر افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھیں اپنی منصبی مصروفیات نے اس کام کی جانب توجہ دینے کی زیادہ فرصت نہیں دی۔ تحقیق کا کام شارٹ کٹ اور تعجیل کا نہیں ہوتا اور پھر یہ بھی کہ تحقیق کا فن اپنے فن کار سے بہت زیادہ محنت' توجہ اور ریاضت کا داعی ہوتا ہے۔ زندہ رُود کے مجموعی مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندہ رُود نہایت عجلت میں کیا گیا کام ہے' اس کی بنیاد تحقیقی اُصولوں پر استوار نہیں۔ ہمارے ہاں مختلف شاعروں کے حوالے سے سوانحی ادب میں کچھ ایسے کام موجود ہیں جنھیں رہنما خطوط کے طور پر پیش نظر رکھا جاسکتا تھا' اقبالیاتی ادب میں اگرچہ ایسی کوئی مستحسن کاوش موجود نہیں مگر غالب کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر' ایس ایم اکرام، مالک رام اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا کام اس نوعیت کا ہے کہ کسی بھی شاعر کے احوال و آثار پر کام کرنے والے کو متذکرہ بالا محققین کا کام سامنے رکھنا چاہیے۔

علامہ، اُردو ادبیات میں سب سے منفرد اور تمام تر شعرا میں ممتاز ترین مقام و مرتبے کے حامل ہیں اور اُن کا زمانہ لمحۂ موجود سے اتنا بعید بھی نہیں کہ وہ تمام ذرائع اور آثار ہماری دسترس میں نہ ہوں' جن سے علامہ کی سوانحی زندگی کی جزئیات کو مرتب کیا جاسکتا ہے۔ زندہ رُود ایک

اعلیٰ تحقیقی کاوش نہ ہونے کے باوجود اقبالیاتی ادب میں ممتاز اور منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کون سے محرکات ہیں جنھوں نے اس کتاب کی مقبولیت اور شہرت کو دو چند کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

-۴-

زندہ رُود کی پہلی جلد کی اشاعت پر ہی داد و تحسین کے وہ ڈونگرے برسے اور حسنِ عقیدت کے وہ پھول نچھاور کیے گئے کہ بعد میں آنے والی دونوں جلدیں تحقیقی حوالے سے کچھ زیادہ نمایاں نہ ہو سکیں' مسئلہ یہ تھا کہ زندہ رُود کے مرتب اور مولف علامہ کے فرزند تھے' لہٰذا نسبی رشتے کی وجہ سے ان کے کام کو ایک ایسی جذباتی فضا میسر آئی جو اقبال کے مداحین، خانوادۂ اقبال کے لیے رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ پھر جاوید اقبال اتنے بڑے منصب پر متمکن تھے کہ ان کے تحقیقی کام کی خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف توجہ نہ دلائی گئی، جس کا وہ مقتضی تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ جب:

۱- جاوید اقبال کو وہ تمام ذرائع' آثار اور لوازمات میسر تھے جو اقبال جیسے عظیم شاعر اور فلسفی کی سوانح حیات کی ترتیب و تہذیب میں مدد و معاون ہو سکتے تھے۔

۲- وہ علمی اور ادبی حوالے سے بھی اتنے قد آور اور موثر تھے کہ وہ اقبال کی سوانح کو جتنی جلدوں میں مرتب اور مدون کرتے، بڑے سے بڑا ناشر اسے چھاپنے کے لیے اپنے سرمائے کو اس اہم کام میں لگانا اپنے لیے کارِ خیر سمجھتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ:

(ا) اتنے ذرائع اور آثار و لوازمات کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے کام کو تحقیقی اور علمی بنیاد فراہم نہ کر سکے۔ اقبال کے قلمی آثار اور بیاضوں تک ان کی رسائی ممکن تھی' بل کہ اکثر و بیشتر بیاضیں خود ان کی اپنی دسترس میں تھیں' جن سے وہ کما حقہٗ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ پھر وہ ایک ایسے شہر میں رہائش پذیر تھے، جسے اگر لائبریریوں کا شہر کہا جائے تو کچھ اتنا بے جا نہیں۔ اسی طرح وہ اتنے اہم منصب پر فائز تھے کہ وہ اس بڑے اور اہم کام کی ترتیب اور تشکیل کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ اقبال شناسوں کی مدد بھی لے سکتے تھے مگر انھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ زندہ رُود میں اقبال کے خطوط اور اُن کے قلمی آثار سے استفادہ نہ ہونے کے برابر ہے

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ کے خطوط کا اکثر و بیشتر حصہ ان کی سوانح، نظریات، ماحول اور معاشرتی تاریخ سے متعلق ہے۔ علامہ کے خطوط سے ان کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعات کی توقیت کی جاسکتی ہے۔ اتنے بھرپور علمی سرمائے کے ہوتے ہوئے زندہ رُود میں جس طرح کے خلا نظر آتے ہیں، انھیں جاوید اقبال کی سہل پسندی ہی تو کہا جائے گا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خطوط کے آئینے میں ان کی زندگی کے اکثر و بیشتر گوشے جگمگا رہے ہیں۔ علامہ کے خطوط اور ملفوظات کی مدد سے ان کی ایک مستند اور نمایاں سوانح عمری مرتب کی جاسکتی ہے کیوں کہ آثار اقبال میں ان کی زندگی اور زندگی کے مالہ و ماعلیہ کی طرف جو اشارے ملتے ہیں انھی کی مدد سے تفصیلی رویوں کو مرتب کیا جاسکتا ہے، مگر ڈاکٹر جاوید اقبال نے شاید اپنے اس کام کو پھیلاؤ سے بچانے کے لیے اس جانب توجہ نہیں دی۔

(ب) جاوید اقبال نے بعض غیر ضروری واقعات کو تفصیل سے بیان کیا اور اہم واقعات کی طرف اپنے آپ کو محض اشارے کنائے تک محدود رکھا۔ علامہ کی زندگی کے وہ گوشے جو بام افق کی طرح شفق انگیز تھے، ان کا تذکرہ اگر اختصار کے ساتھ بھی کیا جاتا تو کچھ عیب نہ تھا، مگر ان رویوں کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا جاسکتا ہے جو ابھی تک اقبالیاتی ادب کے قارئین کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

(ج) لاہور میں رہ کر ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رُود کی ترتیب و تہذیب میں ثانوی مآخذ سے بے پناہ اور بے طرح استفادہ کیا حالاں کہ وہاں کی لائبریوں میں بنیادی اور اولین مآخذ کی کمی نہ تھی۔ خود وہ زندگی بھر جس شعبے سے وابستہ رہے، انھوں نے علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر لکھتے ہوئے بھی انصاف نہیں کیا۔ پوری کتاب پڑھ جایئے کہیں یہ بھی اقبال بہ طور وکیل کا فکری تاثر نمایاں نہیں ہوتا۔ اقبال نے چاہے اس شعبے میں زیادہ دل چسپی نہ لی ہو یا انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو محض اسی شعبے تک محدود نہ بھی کیا ہو مگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے عہد کے اہم تر وکلا میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو مقدمے لڑے، وہ تمام کے تمام عام سطح کے نہ تھے، ان مقدموں کی پیروی اقبال جیسے دانش ور وکیل نے کی تھی اور اُن مقدموں کی کارروائی انگریزی دور کی دستاویزات میں یقیناً موجود ہوگی مگر ہم

دیکھتے ہیں کہ زندہ رُود میں شاید ہی کوئی دستاویز اس سلسلے میں بہ طور مصادر استعمال کی گئی ہو؛ اگر خدانخواستہ اس نوعیت کی دستاویزات ضائع ہوگئی ہوں تو بھی سوانح نگار کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس امر کا اظہار کرتا کہ علامہ کی زندگی کا یہ گوشہ قانونی دستاویزات کی تحفیظ نہ ہونے کی وجہ سے روشنی میں نہیں آ سکا مگر انھوں نے اپنی مرتبہ اور مولفہ کتاب میں اس نوعیت کی کوئی اطلاع بہم نہیں پہنچائی۔

(د) بدقسمتی یہ ہے کہ جسٹس جاوید اقبال نے زندہ رُود میں جہاں جہاں اقبال کے بیانات اور خطبات سے اقتباس کیا، وہاں انھوں نے اُردو تراجم پر انحصار کیا حالاں کہ اس کی اشد ضرورت تھی کہ علامہ کے اصل متن کو محفوظ رکھا جاتا۔ اگر متن میں تحریر کی روانی اور یکسانیت کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا تو ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اُردو کی طرح حواشی اور حوالوں میں اصل متن تو محفوظ کر سکتے تھے، مگر انھوں نے نہ تو اصل متن کو محفوظ کیا اور نہ ہی بنیادی مآخذ کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنایا، بل کہ اصل متن کو بنیادی مآخذ کے بجائے دوسرے درجے کے ترجموں کو بہ طور سند استعمال کیا جہاں سہل پسندی کا یہ عالم ہو وہاں فاضل مرتب و مولف سے کسی اعلیٰ درجے کی تحقیق کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

(ر) اسی طرح زندہ رُود میں اقبال کی زندگی کے جن گوشوں پر روشنی ڈالی گئی وہاں یا تو بنیادی مآخذ کی بجائے ثانوی مآخذ کو استعمال کیا گیا' جیسا کہ اوپر کی مثال سے ثابت کیا گیا یا پھر غیر ضروری تفاصیل میں کوئی اہم گوشہ دب کر رہ گیا یا علامہ کی زندگی کا کوئی پہلو اختصار کی نذر ہوا۔ مثال کے طور پر اس حصے کو دیکھا جا سکتا ہے جو جسٹس صاحب نے اقبال اور احمدیت کے موضوع پر باندھا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے نہ تو علامہ کے تمام تر نظریات و عقائد کا خلاصہ بیان کیا اور نہ ہی مستند مصادر سے علامہ کے عقیدے کی اسناد فراہم کیں۔ چالیس' پچاس صفحوں کے اس حصے کے جواب میں شیخ عبدالماجد نے کوئی ساڑھے پانچ سو صفحات سے زائد ضخامت کی کتاب بہ طور تردید لکھ دی۔ (۸)

اگر جسٹس صاحب پہلے ایڈیشن میں اس جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے تھے تو ان پر لازم تھا کہ اقبال اور احمدیت کی اشاعت کے بعد اس باب پر نظر ثانی کرتے اور شیخ عبدالماجد

کے اعتراضات کا مدلل جواب دیتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ رُود کے اب تک جتنے بھی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، ان میں کسی بھی طرح کی تبدیلی نہیں کی گئی۔ ایک محقق کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے نئے آنے والے ایڈیشنوں میں حک و اضافہ کرتا رہے، مگر جسٹس صاحب نے اس امر کا خیال نہیں رکھا، حالاں کہ علامہ کے آثار میں اتنا مواد موجود ہے کہ اس کی روشنی میں قادیانی مذہب کی بہ آسانی تردید ہوسکتی ہے۔

(س) زندہ رُود کی تین جلدوں میں علامہ کے عقائد پر گفتگو نہیں کی گئی۔ ضروری تھا کہ ایک علیحدہ باب میں علامہ کے عقائد ونظریات کا تذکرہ مرتب کیا جاتا، تاکہ قارئین اقبال کو معلوم ہوتا کہ علامہ نے اسلام کو کس طرح سے سمجھا اور عہد حاضر کے مسائل کو کس حوالے سے شریعت محمدیہؐ کی روشنی میں حل کرنے کی طرح ڈالی۔ مثال کے طور پر علامہ پر ایک اعتراض اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ حدیث کے قائل نہیں تھے اور صرف قرآن کو حجت تسلیم کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نوعیت کے دیگر اعتراضات کا جواب فراہم نہیں کیا۔ اگرچہ علامہ کے ملفوظات میں کچھ ایسی باتیں موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ علامہ، قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث رسول مقبولؐ کی حجیت کے نہ صرف قائل تھے بل کہ دل و جان سے تسلیم کرتے تھے اور اپنی زندگی کے عملی رویوں میں اسے بہ طور سند جانتے اور مانتے تھے۔ محمود نظامی کے مجموعہ ملفوظات، مولانا مہر کی یادداشتوں پر مشتمل مجموعہ اقبالیاتِ مہر اور خطباتِ اقبال کے نظائر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ علامہ، حدیث کو جزو اسلام سمجھتے تھے اور اس کے وہ اتنے ہی قائل تھے جتنا کوئی بھی راسخ العقیدہ مسلمان ہوسکتا ہے، لیکن حیرت ہے کہ سات سو گیارہ صفحوں پر مشتمل زندہ رُود میں کسی ایک آدھ سطر میں بھی علامہ کے عقیدۂ حدیث کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ اس طرح انھوں نے علامہ کے دیگر عقائد اور نظریات کا احاطہ بھی نہیں کیا۔ علامہ قرآن سے کس طرح جدید علم الکلام اور مادی مسائل کا حل تلاش کرنے کے حامی تھے۔ اس ضمن میں بھی زندہ رُود خاموش ہے۔ اس تحقیقی کتاب میں تو اس باب کا احاطہ نہیں کیا گیا کہ علامہ قرآن کی جو تفسیر Islam As I Understand It کے نام سے لکھنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے جو بنیادی خاکہ بھی تیار کیا تھا وہ آثار اقبال کے اس ذخیرے میں مدتوں موجود رہا، جس

کے مالک ومختار خود ڈاکٹر صاحب تھے۔ ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (م: ۱۹۹۸ء) نے اپنی کتاب ارمغانِ اقبال میں اس خاکے کی تمام جزئیات اور تفاصیل بیان کی ہیں مگر ڈاکٹر صاحب سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ اس خاکے کے متعلق اہم تر خدوخال اقبال کی اس سوانح حیات میں بیان کرتے' حالاں کہ اقبال نے یہ منصوبہ ۱۹۲۸ء میں بنایا اور پھر ۱۹۳۸ء تک اس خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے کام کرتے رہے۔ صحت کی خرابی اور حالات کی ستم ظریفی نے انھیں اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس اہم اور ممتاز علمی کام سے عہدہ برآ ہو سکتے مگر انھوں نے اپنے خاکے میں جن خدوخال کو اجاگر کیا ہے' وہ بعد میں آنے والے علما کے لیے کام کرنے کے سلسلے میں ایک اہم اور بنیادی مآخذ کے طور پر نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں علامہ نے خان نیاز الدین خان اور مولانا مودودی سے خط و کتابت بھی کی۔ ان دونوں بزرگوں کے نام معلوم اور محفوظ خطوں میں بھی اس منصوبے کے چند نقوش محفوظ ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے اتنے اہم علمی اور مذہبی منصوبے کے حوالے سے ان تمام معلومات کو یک جا صورت عطا نہیں کی، جو اقبال کے احوال اور آثار کے مجموعوں میں بکھری ہوئی صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔

زندہ رُود کے مطالعے کے دوران میں اس نوعیت کے اکثر و بیشتر تسامحات سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ تو محض تکنیکی فروگذاشتوں کا ایک مختصر سا خاکہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زندہ رُود سینکڑوں اغلاط کا ایک 'نادر' اور 'عمدہ' مجموعہ ہے۔ کیسا اچھا ہو کہ ان امور پر توجہ دے کر زندہ رُود نئے سرے سے شایع کی جائے۔

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱- زندہ رُود (تبصرہ) شمارہ نقد و نظر: ۱۹۸۲ء، اقبال نمبر ۱: جلد نمبر ۴: شمارہ نمبر ۲: علی گڑھ

۲- ششماہی اقبالیات، جنوری تا جون ۱۹۸۶ء' لاہور: اقبال اکادمی' ص ۱۵۵۔۱۵۶: جلد ۲۶' شمارہ ۴

۳- ششماہی اقبالیات: جنوری تا جون ۱۹۹۶ء، ص: ۱۵۶ء

۴- ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات: سعشہ خان لاہور، سورج پبلشنگ بیورو، بار اوّل: ۱۹۹۵ء، ص: ۱۵۱، ۱۵۲

۵- زندہ رُود: حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور

یہ تین جلدوں میں سے پہلی جلد ہے جو ۱۹۷۹ء میں پہلی مرتبہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۸۲ء میں دوسری اور ۱۹۸۵ء میں تیسری مرتبہ من وعن شائع ہوئی۔ ۱۶۰ صفحات کو محیط اس پہلی جلد میں سات ابواب شامل ہیں۔ ان ابواب کی تفصیل یوں ہے:

۱- سلسلہ اجداد

۲- خاندان سیالکوٹ میں

۳- تاریخ ولادت کا مسئلہ

۴- بچپن اور لڑکپن

۵- گورنمنٹ کالج لاہور

۶- تدریس وتحقیق

۷- یورپ

۶- زندہ رُود: حیاتِ اقبال کا وسطی دور

یہ زندہ رُود کی دوسری جلد ہے جو ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور پہلی جلد کی طرح اس کے سات ہی باب ہیں۔ جو یوں ہیں:

۱- فکر معاش

۲- ازدواجی زندگی کا بحران

۳- ذہنی ارتقا

۴- تخلیقی کرشمہ

۵- قلمی ہنگامہ

۶- خانہ نشینی

۷- ہندو مسلم تصادم کا ماحول

اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۱ء، دوسری ۱۹۸۳ء اور تیسری ۱۹۸۷ء میں سامنے آئی۔

۷- زندہ رُود: حیاتِ اقبال کا اختتامی دور

یہ جلد اس سلسلے کی تیسری اور آخری کڑی ہے جو ۴۲۱ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں بھی سات باب شامل ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے:

۱- عملی سیاست کا خارزار

۲- دورۂ جنوبی ہند
۳-مسلم ریاست کا تصور
۴-گول میز کانفرنسیں
۵-افغانستان
۶-علالت
۷-آخری ایام

اس کی پہلی اشاعت ۱۹۸۴ء اور دوسری ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آئی۔

زندہ رُود (یک جا):

زندہ رُود یک جا صورت میں، جنوری ۱۹۸۹ء میں، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ہی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

۸- اقبال اور احمدیت..... شیخ عبدالماجد کی تصنیف ہے، جو انھوں نے جسٹس (ر) جاوید اقبال کی کتاب زندہ رُود کے 'اقبال اور احمدیت' والے متعلقہ مشمولات کے جواب میں ۱۹۹۱ء میں لکھی۔ ۵۵۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب شیخ عبدالماجد نے الحسنین منزل، حسن مارکیٹ، نیو شمس آباد، لاہور سے شائع کی۔ کتاب کے مشمولات کی فہرست ذیل میں پیش کی جا رہی ہے:

باب:۱
فصل ۱: اقبال کا خاندانی پس منظر اور احمدیت
فصل ۲: شیخ عطا محمد صاحب اور مسز ڈورس احمد
فصل ۳: خط منظوم، پیغام بیعت کے جواب میں

باب:۲
فصل ۱: برصغیر کی مذہبی صورت حال کا جائزہ
فصل ۲: سیالکوٹ اور عیسائی مشنری ادارے، سیالکوٹ گزیٹیر
فصل ۳: احمدیت کا مختصر تعارف۔ اسلام کی تائید میں لٹریچر

باب:۳
احمدیت اور انگریز حکمران

باب:۴
علامہ اقبال اور انگریز حکمران
انگریزی حکومت سے اقبال کی وفاداری کا ۳۵ سالہ ریکارڈ
انگریزی حکومت سے اقبال کی وفاداری
شرعی حوالوں کی مزید تفصیل انگریزی حکومت کی شکر گزاری
انگریزی حکومت کی دائمیت کے لیے مسلم شعرا کا دُعائیہ کلام

باب:۵
جماعت احمدیہ اور جہاد
باب:۶
فصل ا: جماعت احمدیہ اور جدوجہد آزادی
فصل ۲: جدوجہد آزادی کے اہم اجتماعات
مسلم سیاست کے تین اہم مراحل
مسلم سیاسیات کے حق میں قادیان سے اٹھنے والی روح پرور آواز
تقابلی جائزہ
فصل ۳: گول میز کانفرنس لندن
فصل ۴: گول میز کانفرنسوں میں تحریک آزادی کی مہم
فصل ۵: آزادیِ ہند کے بارے میں قادیان کی بیت اقصیٰ سے بلند ہونے والی آواز
فصل ۶: پانچ مسلم صوبے
فصل ۷: قرارداد لاہور اور سر محمد ظفر اللہ خان
باب:۷
فصل ا: علامہ اقبال نے ۱۹۳۵ء میں احمدیت کے متعلق اپنی رائے بدل لی
فصل ۲: اقبال نئے مسیحا کی آمد کے متمنی تھے
فصل ۳: اسماعیلیت اور احمدیت' اسماعیلی عقائد
اقبال اور سر آغا خان کا وظیفہ' پنڈت نہرو کے مضامین اور علامہ اقبال کے خطوط (بہ سلسلہ احمدیت)
پنڈت نہرو کے تبصرہ کا ایک نکتہ
فصل ۴: علامہ نے احمدیوں کے خلاف ۱۹۳۵ء سے قبل زبان کیوں نہ کھولی
فصل ۵: احمدی صوبائی لیجسلیٹو میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں (اقبال کا موقف)
فصل ۶: جماعت احمدیہ اور یونینسٹ پارٹی
باب:۸
فصل ا: مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناح سے اقبال اور جماعت احمدیہ کے روابط
فصل ۲: جناح مفاہمت وعدم مفاہمت
ایک اور پہلو: جماعت احمدیہ سے بلاوجہ برہمی
باب:۹
فصل ا: سر فضل حسین پر اعتراضات

فصل۲: سر فضل حسین پر احمدیوں کو آگے بڑھانے کا الزام

باب:۱۰
مسلم اتحاد کو توڑنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

باب:۱۱
فصل۱: کیا اقبال بوجہ علالت' وائسرائے کونسل کی رکنیت کا منصب قبول کرنے کے قابل نہ تھے؟
فصل۲: کیا حکومت پر تنقید کی وجہ سے اقبال کے تقرر کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا؟

باب:۱۲
لیگ کی موت اور ظفر اللہ خاں

باب:۱۳
فصل۱: آل انڈیا کشمیر کمیشن
فصل۲: فرقہ واریت کا فتنہ' مسلم زعما کا بیان
فصل۳: تبلیغ احمدیت کا الزام
فصل۴: حضرت امام جماعت احمدیہ کا دور صدارت اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے تاریخی خطوط' بے غرضانہ خدمات کا اعتراف
فصل۵: کشمیر کمیٹی کی صدارت سے حضرت امام جماعت احمدیہ کا استعفیٰ اور اس کا ردعمل
فصل۶: نیا مرحلہ۔صدارت علامہ اقبال
فصل۷: آئینی جدوجہد کے شیریں ثمرات' علامہ کے استعفیٰ کا جواز کیا ہے؟ کشمیر کمیٹی کو اندر سے توڑنا' کیا احمدی کسی کی اطاعت کے پابند نہیں؟
فصل۸: ممبروں کی اکثریت۔مولانا غلام رسول مہر کا بیان
فصل۹: نئی کشمیر کمیٹی
فصل۱۰: علامہ اقبال۔عملی سیاست کے کمبل سے جان چھڑانے کی فکر کرنے لگے
فصل۱۱: شیخ محمد عبداللہ کا بدکنا
فصل۱۲: پنڈت نہرو اور علامہ اقبال کا ایک جیسا مشورہ
فصل۱۳: حکومت آزاد کشمیر کی بنیاد

باب:۱۴
فصل۱: انٹرویو
فصل۲: امام جماعت احمدیہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد' روٹری کلب لاہور کی میٹنگ میں

باب:۱۵
اخبار زمیندار کے نظریات اور علامہ اقبال

باب:۱۶
تحفظ ختم نبوت کی تحاریک۔دل کی بات

باب:۱۷
لفظ مسلم کی تعریف، محافظین ختم نبوت کا طرز تبلیغ

باب:۱۸
اگر اقبال کچھ عرصہ اور زندہ رہتے

باب:۱۹
اقبال اور احمدیت

باب:۲۰
علامہ اقبال کا روحانی مقام ومرتبہ ونظریات

☆☆☆☆☆

زندہ رُود

جلد اوّل کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

زندہ رُود جلد اوّل سات ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۶۰ ہے' جن میں سے آخری اکیس صفحات (۱۳۹ تا ۱۶۰) حوالہ جات کو محیط ہیں۔ ابواب کی موضوعاتی تقسیم اس طرح ہے:

۱- سلسلۂ اجداد

۲- خاندان سیالکوٹ میں

۳- تاریخ ولادت کا مسئلہ

۴- بچپن اور لڑکپن

۵- گورنمنٹ کالج لاہور

۶- تدریس وتحقیق

۷- یورپ

ڈاکٹر جاوید اقبال پیش لفظ میں زندہ رُود کی ترتیب وتہذیب کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے حیاتِ اقبال پر اس کتاب کو لکھنے کا ارادہ ۱۹۷۵ء کی گرمیوں میں کیا تھا۔ ایک دن میرے دونوں بیٹے منیب اور ولید کمرے میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ میں نے انھیں دیکھ کر سوچا کہ اقبال نے تو مجھے ایک اشارے کے طور پر استعمال کر کے نوجوانان ملت سے خطاب کیا تھا' مگر وقت اس تیزی سے گزر رہا ہے کہ اب ایک نئی نسل وجود میں آ گئی ہے۔ ممکن ہے' یہ نئی نسل اقبال کے اشعار و افکار کو ہم سے بہتر سمجھنے کے قابل ہو، کیوں کہ اقبال تو آنے والے کل یا مستقبل کے شاعر ہیں' لیکن کسی بھی مفکر کے افکار ونظریات سے پوری طرح شناسا ہونے کے

لیے اس کی حیات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اقبال کی شخصیت' شاعری' فکر اور فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اقبال شناسوں نے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بڑی محنت سے کئی مضمون اور کتابیں تحریر کر رکھی ہیں، مگر یہ سارا ذخیرہ بکھرا ہوا ہے اور جو کتب سوانح عمری کے طور پر لکھی گئیں' وہ نسبتاً کم ہیں اور اُن میں سے بیشتر میں درج کردہ تفصیلات ناکافی ہیں۔

اقبال کے اپنے احباب میں سب سے پہلے ان کے حالات زندگی پر مضمون عبدالقادر مدیر مخزن نے لکھا' جو خدنگ نظر (لکھنؤ) کے شمارہ مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔ بعد میں نواب سر ذوالفقار علی خان اور مولوی احمد دین ایڈووکیٹ نے بھی اپنے اپنے کتابچوں میں چند صفحات اس موضوع پر صرف کیے' مگر اقبال کی اپنی زندگی میں کسی نے بھی ان کی سوانح عمری کی صورت میں کوئی جامع کتاب تحریر نہ کی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اقبال خود اس معاملہ میں تعاون نہ کرتے تھے' کیوں کہ انھیں اپنے حالات زندگی کی تشہیر میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔''(۱)

زندہ رُود کی تحریر واشاعت سے قبل علامہ اقبال کی کئی ایک سوانح عمریاں لکھی گئیں' مگر ان میں سے کوئی ایک سوانح عمری بھی تحقیقی اور تنقیدی تقاضے پورے نہیں کرتی۔ اگرچہ ان سوانح عمریوں میں تحقیقی لوازمات موجود ضرور ہیں' مگر ان کی پوری فضا تحقیقی رویوں کی نقیب اور منادنہیں ہے۔ اس پس منظر میں جب جاوید اقبال نے اقبال کی سوانح لکھنے کا پروگرام بنایا' تو اپنے موضوع اور اس کی حدود اور طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

'' سوانح عمری کی ہیئت میں اقبال پر جو کتب ان کی وفات کے بعد اور ولادت اقبال کی صد سالہ تقریبات سے قبل شائع ہوئیں، میں نے انھیں بہ غور پڑھا اور حیاتِ اقبال کے موضوع پر جو دیگر کتب یا مضامین دستیاب ہو سکے' انھیں بھی دیکھا' مگر اقبالیاتی ادب میں بالخصوص اس موضوع پر جن معلومات کی مجھے ضرورت تھی' ان کے حصول میں تشنگی ہی رہی پس میں نے قصد کیا کہ اقبال کی ایک ایسی بائیوگرافی تحریر کرنی چاہیے جس میں خیالات وافکار کے تدریجی ارتقا اور اُن کے ماحول کا زیادہ تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے مگر زندگی کے نجی پہلو کو اقبال ہی کی منشا کے مطابق ثانوی حیثیت دی جائے۔''(۲)

جاوید اقبال نے اس سوانحی عمری کی ترتیب وتسوید میں بہت محنت کی' بنیادی اور ثانوی ہر طرح کے ماخذات پر توجہ دی پھر کہیں جا کر اس سوانح کی صورت گری ممکن ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

'' کتاب میں اقبال کے افکار کے تدریجی ارتقا اور اُن کے ماحول پر بحث زیادہ تفصیل

کے ساتھ کی گئی ہے اور زندگی کے نجی پہلو کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب صرف سوانح اقبال پر مشتمل نہیں؛ بل کہ عہد اقبال کی تاریخ بھی ہے۔ کتاب؛ اقبال کی حیات میں ایک نہایت اہم فکری انقلاب پر ختم ہوتی ہے جب؛ ان کی تعلیم کی تکمیل ہو چکی تھی یا ان کا تشکیلی دور ختم ہو چکا تھا اور اُن کی شاعری مختلف مراحل یا ادوار سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی؛ جہاں سے اس نے آواز رحیل کارواں، نغمۂ جبرئیل آشوب یا جزو پیغامبری بننے کے لیے جست لینی تھی۔''(۳)

جاوید اقبال نے علامہ کی سوانح کا نام زندہ رُود رکھا؛ وہ جلد اوّل میں اس نام کی توجیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

زندہ رُود نام اقبال نے اپنے لیے خود جاوید نامہ میں منتخب کر رکھا ہے۔ زندہ رُود کے معنی ہیں مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی؛ اقبال اس کی تعریف میں فرماتے ہیں:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی، لچکتی، سرکتی ہوئی

اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

اقبال کی حیات دراصل ان کی فکری زندگی کا ارتقا ہے؛ جو ایک مستقل حال میں جاری اور رواں دواں ہے اور جسے موت نہیں چھو سکتی۔ وہ اپنی جسمانی زندگی کو غیر اہم سمجھتے تھے؛ اس لیے حیاتِ اقبال کو زندہ رُود کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔

زندہ رُود نام بھی انھوں نے غالباً آنحضورؐ کے حوالے سے اپنے لیے چنا۔ اس کا پس منظر یہ

ہے کہ اقبال جرمن شاعر گوئٹے کے بڑے مداح تھے۔ گوئٹے قرآنی تعلیمات اور حیات طیبہ سے بے حد متاثر تھا۔ یہاں تک کہ اس نے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایک منظوم تمثیل تحریر کرنے کا ارادہ کیا' لیکن صرف ابتدائیہ ہی لکھ سکا' تمثیل کی تکمیل کی نوبت نہ پہنچی۔ اس ابتدائیہ یا نظم بعنوان نغمۂ محمد ﷺ میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی آپس میں گفتگو کے دوران گوئٹے نبوت کی تشریح کے سلسلہ میں آنحضورؐ کے لیے حیات آفریں جوئے آب' کی تشبیہ استعمال کرتا ہے' جس کا کام بہت سے نالے ندیوں کو اپنی آغوش میں لے کر سمندر یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانا ہے۔ اقبال نے یہ نظم پڑھی ہوئی تھی اور اس کی تشبیہات اور استعارات سے بخوبی واقف تھے' بل کہ اس کا آزاد ترجمہ بھی پیامِ مشرق کی نظم جوئے آب میں کیا تھا۔ چوں کہ وہ آنحضور ﷺ کو انسان کامل سمجھتے تھے اس لیے ان کے نزدیک ہر مسلمان کے لیے آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر چلنا فرض تھا۔ اسی جذبہ کے تحت انھوں نے جاوید نامہ کے روحانی سفر کے لیے اپنا نام زندہ رُود منتخب کیا۔''(۴)

زندہ رُود (جلد اوّل) ایک ہزار کی تعداد میں ۱۹۷۹ء میں پہلی بار شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس حصے (جلد) میں جاوید اقبال نے علامہ کے تشکیلی دور کا احاطہ کیا۔ اقبال کی ولادت سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کے احوال و آثار اس میں زیر بحث آئے ہیں۔ پس منظر کے طور پر آباؤ اجداد کا تذکرہ اور کشمیر سے سیالکوٹ تک ان کے سفر کی داستان بھی اپنی جملہ وضاحتوں کے ساتھ موجود ہے۔ پروفیسر اُسلوب احمد انصاری جلد اوّل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ صرف ۳۱ سال کے حالات کا جائزہ ہے۔ اس حد بندی کے باوجود اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر اقبال کے حالات زندگی کا محض سلسلہ وار' بے مزہ اور سپاٹ خاکہ نہیں ہے' بل کہ ان کے نجی حالات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ہی اس سوانح عمری کا تعلق اور واسطہ اس وسیع معاشرتی' سیاسی اور علمی پس منظر یا ان معنی خیز خارجی محرکات سے بھی گہرا ہے' جو ان کی شخصیت کے خدوخال کی تعمیر نو' تشکیل میں ممد و معاون ہوئے۔''(۵)

زندہ رُود جلد اول میں ۳۱ سال کے احوال و آثار تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں علامہ کا ذہن اور فکر' جن جن تشکیلی عوامل سے گزرتے رہے' جاوید اقبال نے ان واقعات کو مرحلہ وار سپرد قلم کیا زندہ رُود کے دیباچے میں انھوں نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ وہ اپنی تمام تر محبت اور عقیدت کے باوجود دوران تحریر علامہ کے لیے ان کے نام کا

صرف ایک لفظ 'اقبال' استعمال کریں گے:

''کتاب میں انھیں جذبۂ محبت کے تحت اقبال تحریر کیا ہے' لیکن اس بے تکلفی میں عقیدت مندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ اقبال کی وفات پر میری عمر ساڑھے تیرہ برس تھی۔ اس لیے میں ان کے ہم عصر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ البتہ ان کے عہد سے دوری کے سبب مجھے اپنے نقطۂ نگاہ یا انداز تحریر کو خارجی رکھنے میں آسانی محسوس ہوئی ہے۔''(۶)

(۲)

زندہ رُود (جلد اول) کے پہلے تین باب:

۱- سلسلۂ اجداد (صفحات ۲۷)

۲- خاندان سیالکوٹ میں (صفحات ۲۶) اور

۳- تاریخ ولادت کا مسئلہ (صفحات ۲۶)

ایک ہی بحث کی تین سلسلے وار کڑیاں ہیں۔ ان ابواب کا داخلی ماحول خالصتاً تحقیقی ہے۔ ان میں جاوید اقبال نے حیاتِ اقبال کے مختلف پہلوؤں کو درست تناظر میں پیش کرنے کے لیے بے پناہ کوشش کی ہے۔ اُلجھے ہوئے اور نیم تحقیقی ماخذات سے مسائل زیر بحث کو اس قدر خوب صورتی اور دل کشی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ شاید ہی تحقیق کا کوئی پہلو زیر بحث آنے سے رہ گیا ہو اور دو تین مقامات پر جہاں خود کچھ معاملات اُلجھائے وہ بھی اتنی ہی دل کشی اور خوب صورتی سے اُلجھائے کہ ان کے سلجھنے کی صورت بھی کم ہی ممکن ہے۔ (اس کا حوالہ باب کے آخر میں آئے گا)۔ جاوید اقبال نے علامہ کی سوانح کا آغاز ان کے آباؤ اجداد کے احوال و آثار سے کیا ہے۔ وہ تاریخ کے دھاروں میں بہت دور تک نکل گئے اور دیر تک کشمیر کی وادیوں میں سرگرداں رہے' مگر صدیوں کے اس علمی سفر سے جب وہ لوٹے' تو پہلی بار علامہ کے آباؤ اجداد کے آثار حقیقی اور فطری تناظر میں سامنے لائے۔ خاندان کے پہلے بزرگ جو مشرف بہ اسلام ہوئے' وہ بابا لول حج تھے۔ محمد دین فوق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے (تخت نشینی ۸۲۴ھ وفات ۸۷۴ھ) میں حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولی کے ارادت مندوں میں حضرت بابا نصرالدین ایک بہت بڑے بزرگ

گزرے ہیں۔حضرت شیخ العالم نے اپنے اشعار (کشمیری) میں اپنے اس نام ور خلیفہ کا بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ بابا نصر الدین کے مریدوں میں بابا لولی حج ایک بزرگ تھے، جنھوں نے کئی حج کیے تھے اور بارہ سال تک کشمیر سے باہر سیر و سیاحت ہی میں رہے تھے۔ چناں چہ مصنف تاریخ اعظمی صفحہ۲۷ پر لکھتا ہے: دوازدہ سال سیاحت کردو بہ کشمیر آمدہ باشارت غیبی مرید حضرت بابا نصر الدین شد و بقیہ عمر در خدمت وصحبت اوگزرانید۔ان کا اصل نام معلوم نہیں ہوسکا۔لول حج یا لولی حاجی کے نام سے انھوں نے شہرت پائی۔انھوں نے کئی حج پا پیادہ کیے تھے۔لول یا لالہ یا لال' کشمیر میں پیار یا عزت کا لفظ ہے، جیسے بڑے بھائی کو کا کا لال کہتے ہیں۔وطن ان کا پرگنہ آدوَن کے موضع چکو میں تھا۔قبول اسلام سے قبل ذات کے برہمن تھے۔ گوت سپرو تھی۔ پیشہ ان کا زراعت کاری اور زمینداری تھا لیکن جب فقر اختیار کیا تو سب باتوں سے کنارہ کش ہوگئے۔آپ کی قبر چرار شریف میں احاطہ مزار شیخ نور الدین ولی کے اندر ہے جہاں ان کے مرشد بابا نصر الدین بھی مدفون ہیں۔ چناں چہ صاحب تاریخ اعظمی لکھتے ہیں وقت رحلت در آستانہ چرار در جوار پیر بزرگوار آسود۔''(۷)

جاوید اقبال کی فراہم کردہ ان معلوماتی تفاصیل پر تنقید کرتے ہوئے سعشہ خان نے اپنی کتاب ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات میں لکھا ہے کہ:

'' ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے اسی باب میں مختلف حوالے استعمال کیے ہیں۔ جوانھوں نے ادبی دُنیا مئی ۱۹۶۵ء، تاریخ بڈشاہی، طباعت: ۱۹۴۴ء، اقبال کے حضور، جلد اول، نقوش، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء احسان، اقبال نمبر ۲۷ جون ۱۹۵۸ء سے اخذ کیے ہیں ،لیکن ان کتب کا ذکر نہیں کیا ، جو ان کے نزدیک مستند نہ تھیں۔ بہر حال ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ اقبال کے سلسلۂ اجداد میں جو حوالے دیے ہیں۔انھیں ہم کسی بھی صورت ناکافی نہیں گردان سکتے، کیوں کہ ان حوالوں کے بعد اقبال کے شجرۂ نسب سے متعلق تشنگی باقی نہیں رہتی، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دوسرے حوالوں کے ساتھ علامہ اقبال کے اپنے اشعار سے بھی حوالے کشید کیے ہیں۔مثلاً: جہاں پر جاوید اقبال یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کی سوانح کے ہیرو علامہ اقبال کا خاندان دُنیا کے مقابلے میں ہمیشہ دین کو ترجیح دیتا تھا، وہ ضرب کلیم ، میں علامہ کی نظم 'جاوید سے' کا حوالہ دیتے ہیں:

دربار شہنشہی سے خوش تر
مردان خدا کا آستانہ

خالی ہوا ان سے دبستاں
تھی جن کی نگاہ تازیانہ

جس گھر کا مگر چراغ ہے تو
ہے اس کا مذاق عارفانہ(۸)

پہلے باب 'سلسلۂ اجداد' کی ترتیب وتحریر کے وقت جاوید اقبال نے ان تمام ماخذات سے استفادہ کیا ہے' جو اس ضمن میں' ان کے مطالعاتی رخ کو ایک خاص نہج پر استوار رکھ سکتے تھے۔ محمد دین فوق کی کتابوں سے اخذ واستفادہ کے باوجود انھوں نے ان پر تنقید کی ہے اور اُن کے تحقیقی مغالطوں کو واضح کیا ہے۔ مثلاً: فوق کے یہاں علامہ کے آباؤ اجداد پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں تسامحات در آئے ہیں۔ جاوید اقبال نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فوق کی اس تفصیل میں کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ شیخ محمد رفیق اور اُن کے بھائیوں کے والد کا نام شیخ جمال الدین تھا' کیوں کہ شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق بعض رجسٹری شدہ مسودات میں ان کی ولدیت یونہی درج ہے، اسی طرح شیخ محمد رفیق کے اسم نامعلوم بھائی کا نام شیخ عبدالرحمٰن تھا۔ یہ درست نہیں کہ انھوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور لاولد فوت ہوئے۔ شیخ عبدالرحمٰن کی رہائش بھی سیالکوٹ ہی میں تھی اور اُن کی اولاد آج تک وہیں آباد ہے۔ اسی طرح شیخ عبداللہ کی اولاد بھی سیالکوٹ میں آباد ہے' گو یہ صحیح ہے کہ ان کے خاندان میں سے بعض افراد حیدر آباد دکن چلے تھے۔ فوق ذکر کرتے ہیں کہ شیخ محمد رمضان' اقبال کے دادا کے بھائی نے فارسی زبان میں تصوف پر چند ایک کتابیں بھی لکھیں' لیکن ان کتب کی تفصیل دی ہے، نہ یہ بتایا ہے کہ ان کی اس اطلاع کا ذریعہ کیا تھا۔''(۹)

جاوید اقبال نے روزگار فقیر کے حوالے سے علامہ کے آباؤ اجداد کی کشمیر سے سیالکوٹ کی طرف ہجرت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ روزگار فقیر کی دوسری جلد میں مرقوم ہے:

''علامہ اقبال کے آباؤ اجداد میں کس نے اور کب کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی، اس بارے میں پورے وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ قرائن یہ ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہوگی اور

ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال الدین تھے یا ان کے چار بیٹے جن کے نام شیخ عبدالرحمٰن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق، اور شیخ عبداللہ تھے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ شیخ جمال الدین نے اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر ترک وطن کیا ہو۔ بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ ان میں علامہ اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق اور اُن کے دو بھائی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ محمد رمضان تو سیالکوٹ میں رہتے تھے اور تیسرے بھائی شیخ عبداللہ موضع جیٹھی کے میں۔ ان چاروں بھائیوں کی اولاد آج تک شہر سیالکوٹ اور موضع جیٹھی کے میں آباد ہے۔ علامہ کے دادا کی پہلی شادی شہر سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ وفات پا گئیں۔ دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ یہ بیوی بہت خوب صورت تھیں، اس لیے ان کا لقب 'گجری' پڑ گیا۔ ان سے شیخ محمد رفیق کے اوپر تلے دس لڑکے ہوئے اور سب کے سب فوت ہو گئے۔ علامہ کے والد شیخ نور محمد، شیخ محمد رفیق کی گیارہویں اولاد تھے۔ ان کی پیدائش پر گھر کی عورتوں نے بڑی منتیں مانیں۔ پیروں فقیروں سے دُعائیں بھی کرائیں۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی نیک دل بزرگ کی دُعا قبول ہوئی اور علامہ کے والد نہ صرف زندہ رہے، بل کہ طویل عمر پائی۔ قمری حساب سے ان کی عمر ۹۶ سال اور شمسی حساب سے ۹۳ سال کی ہوئی۔ انھوں نے اپنے قابلِ فخر بیٹے اقبال کی شہرت، عزت اور مقبولیت کی بہاریں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ علامہ کے والد کی پیدائش کے بعد ان کے والدین کے یہاں ایک اور لڑکا بھی پیدا ہوا، ان کا نام غلام محمد تھا۔ وہ محکمہ نہر میں اوورسیئر تھے اور روپڑ ضلع انبالہ میں متعین تھے۔ شیخ محمد رفیق اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے روپڑ گئے ہوئے تھے کہ وہیں ہیضہ ہوا اور اسی مرض میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ روپڑ ہی میں وہ دفن ہوئے۔ شیخ غلام محمد نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ وفات کے وقت ان کی دو لڑکیاں حیات تھیں، جن کی اولاد شہر سیالکوٹ میں آج تک آباد ہے۔''(۱۰)

جاوید اقبال نے اس باب میں نہ صرف علامہ کے آباؤ اجداد، ان کے قبول اسلام اور کشمیر سے سیالکوٹ کی طرف ہجرت کو موضوع گفتگو بنایا ہے، بل کہ ان ادوار کے سیاسی، سماجی، فکری اور مذہبی حالات کا بھی جائزہ لیا ہے اور پھر اس باب کو دوسرے باب کی تفاصیل کے ساتھ اس انداز سے مربوط کیا ہے کہ بہ قول سعشہ خان:

''ڈاکٹر جاوید اقبال پہلے باب کو مکمل کر کے دوسرے باب کو اس سے منسلک کرتے ہیں۔ یہ

باب درحقیقت پہلے باب کے تسلسل میں ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دوسرے باب کا عنوان 'خاندان سیالکوٹ میں' رکھا ہے۔ سوانح نگاری میں نسبی سلسلے کی تفصیلات اس طرح بیان کی جاتی ہیں کہ اس سے سلسلۂ نسب کی تفصیلات ایک فرد کی شخصی طبیعت، رجحان، مزاج اور ذہن کو توارث کے اُصول کی روشنی میں سمجھنا آسان ہوتا ہے۔ کم وبیش یہی صورت آباؤ اجداد کے رہائشی علاقوں کی بابت معلومات سے عبارت ہے، جس مقام پر موضوع گفتگو شخصیت پیدا ہوتی ہے، اس کی تاریخی حیثیت کے علاوہ، جذباتی، ذہنی اور احساساتی، تاثراتی اعتبار سے شخصیت کی تشکیل میں جو ایک شہر یا قصبہ کردار ادا کرتا ہے۔ سوانح نگار اس کا بھی سراغ لگاتا ہے۔''(۱۱)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس باب میں 'خاندان اقبال' کی تفصیلات بھی دی ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ سیالکوٹ کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے اپنے آپ کو محض سیالکوٹ تک ہی محدود نہیں رکھا، بل کہ ۱۳۵۱ء سے ۱۸۵۷ء تک برصغیر میں وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ مثلاً: وہ شہر اقبال کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''سیالکوٹ پنجاب کے شمال مشرق میں ایک نہایت قدیم شہر ہے۔ فوق کی تحقیق کے مطابق اسے پانچ ہزار سال یا اس سے بھی زائد عرصہ قبل راجہ شل نے آباد کیا اور شاکل نام رکھا۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ شاکل نگری اپکاندی کے کنارے مدردیش میں واقع ہے۔ اس زمانے میں پنجاب کا یہ حصہ مدردیش کہلاتا تھا اور سیالکوٹ کے معروف نالہ ایک کو اپکاندی پکارا جاتا تھا۔ مہاراجہ چندر گپت بکرماجیت کے عہد میں جسے گزرے تقریباً دو ہزار سال ہو چکے ہیں۔ راجہ شالباہن نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ قلعہ کو پنجابی زبان میں کوٹ کہا جاتا ہے، اس لیے یہ قلعہ شالکوٹ پکارا جانے لگا اور صدیوں بعد سیالکوٹ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ شالباہن کا بیٹا پورن جو تارک الدُنیا اور فقیر ہو کر پورن بھگت کہلایا، کے کئی قصے پنجابی زبان میں دستیاب ہیں۔ سیالکوٹ کے شمال میں کوئی چار میل کے فاصلے پر موضع کو دل میں وہ چاہ بھی موجود ہے جس میں پورن کو پھینکا گیا تھا اور جہاں اکثر ہندو مستورات بخواہش اولاد ہر نئے چاند کی پہلی اتوار کو جا کر نہایا کرتی تھیں۔

سیالکوٹ ابتدائی مسلم سلاطین کے مختلف ادوار سے گزرا، لیکن چودھویں صدی میں سلطان فیروز تغلق کے عہد میں ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء میں جب دہلی میں بدنظمی اور ابتری کا ظہور ہوا، تو سیالکوٹ کے باجگزار حکمران راجہ سہنپال نے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر قلعہ کو مضبوط بنانا چاہا۔

اسے نجومیوں اور جوتشیوں نے مشورہ دیا کہ قلعہ کے چاروں گوشوں اور فصیل کی بنیادوں پر اگر کسی مسلمان کا خون چھڑکنے کے بعد از سرِ نو تعمیر کا کام شروع کیا جائے، تو راجہ کے غنیم اسے کبھی سر نہ کر سکیں گے۔ پس راجہ کے آدمیوں نے ایک مسلم نوجوان کو پکڑا اور بے دردی سے ذبح کر کے اس کا خون استعمال میں لایا گیا۔ اس نوجوان کی بوڑھی ماں روتی پیٹتی سیالکوٹ سے باہر نکل گئی اور بیٹے کے ماتم میں شہر بہ شہر اور در بدر پھرتی ہوئی سیّد امام علی لاحق [الحق] بن سیّد حسن کی خدمت میں حاضر ہوئی، جو ان دنوں کوہستان کانگڑہ کے نواح میں گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھے۔ انھوں نے راجہ سہنپال کے ظلم وستم کی دردناک کہانی سن کر بڑھیا سے امداد کا وعدہ کیا۔ حسن اتفاق سے چند یوم بعد سلطان فیروز تغلق کا گزر اس طرف سے ہوا۔ حضرت امام نے سلطان سے بڑھیا کی المناک داستان اور راجہ کی سنگدلی کا ذکر کیا۔ سلطان نے ایک لشکر امام صاحب کے سپرد کیا، تاکہ راجہ کا قرار واقعی انتظام کر کے خلق خدا کو اس کے استبداد سے نجات دلائی جائے۔

امام صاحب اپنے مریدوں اور لشکر سمیت امام حسینؓ کی تقلید میں سیالکوٹ کی جانب روانہ ہوئے اور راجہ کے ساتھ جنگ کی۔ راجہ سہنپال نے قلعہ کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا ہوا تھا کہ بظاہر اس پر فتح پانا مشکل تھا۔ امام صاحب نے نالہ ایک کے جنوب میں پڑاؤ ڈالا۔ دو دن تک گھمسان کی لڑائی جاری رہی، لیکن لشکر ایک پار نہ کر سکا۔ تیسرے دن کے معرکے میں مسلمان نالہ عبور کرنے میں کامیاب ہوئے اور راجہ قلعہ میں محصور ہو گیا۔ کئی دنوں تک محاصرہ قائم رہا۔ بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور قلعہ سر ہو گیا، لیکن بہت سی نام ور ہستیاں شہید ہوئیں۔ خود امام صاحب زخمی ہو گئے۔ زخم اس قدر شدید اور گہرے تھے کہ آپ جانبر نہ ہو سکے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد سیالکوٹ میں ہندو راج کا خاتمہ ہو گیا۔'(۱۲)

جاوید اقبال نے اس باب میں سیالکوٹ کی تاریخ کا مختصراً تذکرہ کرتے ہوئے 'اقبال کے بزرگوں کی سیالکوٹ آمد پر روشنی ڈالی' اس شہر کے سیاسی وسماجی احوال کا ذکر کیا اور خاندان اقبال اور بزرگان اقبال کے بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔ اس باب کا انداز تحریر سراسر تحقیقی نوعیت کا ہے۔ جاوید اقبال نے اس باب کی ترتیب وتسوید کے لیے لوازمہ حسبِ ذیل کتابوں سے اخذ کیا ہے:

تاریخ سیالکوٹ، تاریخ اقوام کشمیر، ہندی مسلمان، سیرت سیّد احمد شہید،

برطانوی ہند، کلکتہ ریویو، ہند میں جدید اسلام، اقبال کے حضور، ذکرِ اقبال، حیاتِ جاوید، مضامین تہذیب الاخلاق اور ہند کا تاریخی جغرافیہ۔

زندہ رُود کا تیسرا باب اقبال کی تاریخ ولادت کے مسئلے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسی باب میں علامہ کی صحیح اور متحقق تاریخ پیدائش کو بہ دلائل ثابت کیا گیا ہے۔ یہ حیاتِ اقبال کا ایک اُلجھا ہوا اور متنازع فیہ مسئلہ رہا ہے' مگر جاوید اقبال نے مستند دلائل سے ۹/نومبر ۱۸۷۷ء کو بہ طور تاریخ پیدائش اقبال ثابت کیا ہے۔ اقبال کی پیدائش کے پانچ سن بتائے جاتے ہیں: ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۳ء، ۱۸۷۵ء، ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۷ء.....اقبال نے خود اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ۱۸۷۶ء لکھا ہے۔ جاوید اقبال نے تمام مروجہ تاریخیں لکھنے کے بعد ان پر اُصولی بحث کی ہے اور حیاتِ اقبال کی داخلی شہادتوں کی بنا پر ان معروف تاریخوں کو غلط ثابت کیا ہے اور اُن کی تردید مربوط دلائل سے کی ہے۔

(۳)

زندہ رُود (جلد اوّل) کے چوتھے' پانچویں اور چھٹے ابواب کے عنوانات یہ ہیں:

۴- بچپن اور لڑکپن (صفحات ۲۴)

۵- گورنمنٹ کالج سیالکوٹ (صفحات ۱۲)

۶- تدریس وتحقیق (صفحات ۲۶)

ان ابواب میں جاوید اقبال نے علامہ کے افکار کے تدریجی ارتقا اور ماحول پر بحث کی ہے، جس میں علامہ اقبال کے فکر نے تشکیل پائی۔ ان ابواب میں' سوابق میں زیر بحث لائے گئے تین ابواب کی طرح کوئی اُلجھا ہوا مسئلہ درپیش نہیں رہا، بل کہ ان میں سیرت اقبال کی نشوونما زیادہ روشن انداز میں نمایاں ہوئی ہے۔

چوتھے باب میں جاوید اقبال نے علامہ کے بچپن اور لڑکپن کے زمانے کا احاطہ کیا ہے اور وہ تمام تر ضروری تفاصیل فراہم کی ہیں' جو حیاتِ اقبال کے اس دور سے متعلق ہیں۔ ان معلومات کی فراہمی میں انھوں نے اپنے اُسلوب کو نہایت تازہ اور شاداب رکھا ہے' کہیں بھی

سپاٹ نہیں ہونے دیا، ورنہ حقیقت میں زندہ رُود کی تحریر و ترتیب کے دوران میں ایسے مقامات بہت کم آئے ہیں، جہاں جاوید اقبال نے قلم سنبھال کر لکھا ہو۔ ان کی نثر سادہ اور سہل تو ہے لیکن اس میں حُسن پیدا نہیں ہو سکا، مگر اس مجموعی تاثر کے برعکس اس باب میں یہاں وہاں، مختلف مقامات پر اُسلوب اظہار نے شگفتہ اور قدرے رنگین صورت اختیار کر لی ہے۔ مثلاً: علامہ کے گھر کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''بجلی کی سہولت سے محروم اس گھر کے محدود دالان میں اس نے چلنا سیکھا اور پھر تعلیم کے آغاز کے بعد اسی گھر کی تاریک کوٹھڑیوں میں چراغ کی روشنی میں اس نے ابتدائی سبق ازبر کیے۔''(۱۳)

اس باب میں جاوید اقبال نے علامہ کے والدین' گھر کے حالات' ابتدائی تعلیم' اساتذہ' خاص طور پر مولوی میر حسن اور علامہ کے مشاغل کا تذکرہ کیا ہے۔ دو چار صفحات میں سرسیّد احمد خان کی تعلیمی خدمات کا ذکر بھی آیا ہے اور اس پس منظر میں انھوں نے برصغیر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی فضا کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ اسی زمانے میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا، بہ قول جاوید اقبال:

''لہٰذا علم و شاعری کے میدانوں میں بھی ابھی خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی۔ پس قدرت کے بوئے ہوئے بیج میں پھلنے پھولنے کی اہلیت تو تھی' کیوں کہ کچھ حد تک اس کی آبیاری ہو چکی تھی ،لیکن کلی کا پھول بن کر کھلنا ابھی باقی تھا۔''(۱۴)

اسی زمانے میں علامہ اقبال سیالکوٹ کی فضا سے نکل کر گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے بہ طور طالب علم یہاں چار سال کا عرصہ گزارا اور اعزاز کے ساتھ فلسفے میں ایم اے کیا۔ ایم اے کے بعد وہ اس کالج سے وابستہ ہو گئے اور اپنے یورپ کے سفر تک اس سے متعلق رہے۔ گورنمنٹ کالج کے علمی' ادبی اور فکری ماحول نے ان کی شخصیت سازی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ اپنے استاد آرنلڈ کے ہمیشہ ممنون احسان رہے۔ ان کے اس زاویۂ ارادت پر ہر اقبال شناس نے روشنی ڈالی ہے' مگر جاوید اقبال کا انداز نظر ملاحظہ ہو:

''بہر حال یہاں اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ استاد [آرنلڈ] سے گہرے روابط اور تعلق خاطر کے باوجود اقبال آرنلڈ کی شخصیت اور اس کی حدود سے پوری طرح آشنا تھے''۔(۱۵)

گورنمنٹ کالج میں زمانہ تعلیم کی تکمیل کے بعد جاوید اقبال نے علامہ کی تدریس و تحقیق

کو موضوعِ تحقیق بنایا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے اقبال کے ذہنی سفر کی تشکیل سازی کی تمام تر تفصیلات ملتی ہیں۔ اقبال نے شاعری کا آغاز سیالکوٹ کے زمانے میں کیا' لیکن نثر نگاری کی طرف وہ ۱۹۰۰ء کے قریب متوجہ ہوئے۔ یورپ جانے سے قبل انھوں نے مندرجہ ذیل تراجم و تالیفات مرتب کیں:

۱-نظریۂ توحید مطلق (انگریزی)
۲-ارلی پلانجنٹس کی اُردو تلخیص وترجمہ
۳-پولیٹیکل اکانومی کی اُردو تلخیص وترجمہ
۴-علم الاقتصاد

جاوید اقبال نے اس باب میں نہ صرف مذکورہ بالا تراجم و تالیفات کا تذکرہ کیا ہے' بل کہ ان پر تفصیلی بحث بھی کی ہے۔ ان کے متنوع موضوعاتی رویوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ علم الاقتصاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کتاب کے مختلف ابواب میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے، وہ یہ ہیں: علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق' پیدائش دولت (زمین، محنت اور سرمایہ، کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے)، تبادلۂ دولت (مسئلۂ قدر، تجارت بین الاقوام، زر نقد کی ماہیت اور اس کی قدر، حق الضرب، زر کاغذی' اعتبار اور اس کی ماہیت)، پیداوار دولت کا حصہ دار (لگان، ساہوکار کا حصہ یا سود، مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع محنتی کا حصہ یا اجرت، مقابلہ ناکامل دست کاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے، سرکار کا حصہ یا مال گزاری)، آبادی (وجہ معیشت، جدید ضروریات کا پیدا ہونا، صرف دولت)''(۱۶)

اقبال نے نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کو اپنائے رکھا' اس دور میں وہ غزل سے نظم کی طرف آ گئے۔ ان کی نظمیں مخزن میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کی اس دور کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اس دور کی شاعری میں بہت کچھ تھا۔ عشق مجازی کی گونج تھی؛ روایتی تصوف تھا؛ فطرت کی مناظر کشی تھی؛ بچوں کے لیے نظمیں تھیں؛ مغربی شاعری کے آزاد تراجم تھے؛ ہنگامۂ کائنات' حسن و جمال اور وطنی قومیت کے احساسات تھے؛ اسلامیات کا عنصر بھی موجود تھا' مگر سب کچھ

وسیع المشربی کے بعد ہمہ اوست میں غرق تھا۔ نظم و زہد اور رندی، میں ایک مولوی صاحب نے جو اعتراض ان پر کیے کہ گو شعر تو اچھے کہتا ہے' لیکن احکام شریعت کی پابندی نہیں کرتا: صوفی بھی معلوم ہوتا ہے اور رند بھی ہے؛ مسلمان ہے مگر ہندو کو کافر نہیں سمجھتا؛ طبیعت میں کسی قدر تشیع بھی ہے، کیوں کہ تفضیل علیؓ کرتا ہے؛ راگ کو داخل عبادت سمجھتا ہے؛ رات کو محفل رقص و سرود میں شریک ہوتا ہے' لیکن صبح کے وقت خشوع و خضوع سے تلاوت بھی کرتا ہے؛ اس کی جوانی بے داغ بھی ہے اور شعرا کی طرح اسے حسن فروشوں سے بھی عار نہیں۔ آخر اس مجموعۂ اضداد کی سیرت کیا ہے؟ تو جو جواب اقبال اس کا دیتے ہیں۔ وہ اس دور میں ان کے مزاج کی صحیح کیفیت تھی:

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

اہلِ زبان اقبال کے جدید اسالیب بیان میں کیڑے نکالتے تھے۔ وہ تو حالی کی زبان کو بھی مستند نہ سمجھتے تھے' کیوں کہ حالی کا وطن پانی پت تھا' جہاں کی زبان ٹکسالی نہ تھی۔ سو، شروع ہی سے ٹکسالی زبان کے مدعیان نے اقبال کی زبان اور محاورے پر اعتراض وارد کیے۔ اودھ پنچ نے اپنے مخصوص انداز میں ان کے انداز بیان کا مضحکہ اڑایا۔ ۱۹۰۳ء میں کسی اخبار میں 'تنقید ہمدرد' کے نام سے ان کی زبان اور فن پر اعتراضات اٹھائے گئے۔ اقبال نے جواب میں 'اُردو زبان پنجاب میں' کے زیرعنوان ایک مضمون تحریر کیا، جو مخزن میں شائع ہوا۔ اس جوابی مضمون کے کچھ حصے ذکرِ اقبال میں دیے گئے ہیں۔ سالک کا تجزیہ ہے کہ گو ابھی ان کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی' اقبال علوم مغربی کا بحر بے پایاں ہونے کے باوجود فارسی اور اُردو شاعری اور اُن دونوں زبانوں کے غوامض کے ماہر تھے۔''(۱۷)

اس باب میں جاوید اقبال نے ۱۹۰۵ء تک علامہ کے ذہنی اور فکری سفر کی سرگزشت قلم

بند کی ہے۔ اس جلد کا آخری باب ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے' جو یورپ کے قیام کے دوران میں' علامہ کو پیش آئے اور جن رویوں سے وہ ذہناً گزرتے رہے۔

(۴)

۷) اس جلد کا آخری باب ''یورپ'' ۲۷ صفحات کو محیط، نہایت اہم باب ہے۔ چوں کہ علامہ کی زندگی میں قیام یورپ کو بہت اہمیت حاصل ہے' اس لیے یہ باب بھی اہمیت و افادیت کا حامل ہے۔ حیاتِ اقبال کے تشکیلی دور میں' یہ تین سال (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس دورانیے میں علامہ نے بار ایٹ لا کیا اور پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا۔ اسی زمانے میں انھیں اپنے بعض ابتدائی فکری تصورات پر غور کرنے کا موقع ملا' تو انھوں نے کئی ایک نظریات سے رجوع کر لیا۔ مثلاً:

۱۔ تصوف کے عمومی تصور سے

۲۔ تصور وطنیت سے

ابتداً وہ تصوف کے بے پناہ قائل تھے' قیام یورپ کے بعد بھی وہ قائل تو ضرور رہے' مگر اس میں عجمی تصورات کا بھی یہاں وہاں مختلف مقامات پر تذکرہ کیا۔ اس طرح یورپ میں وہ تصور وطنیت سے قومیت کے اسلامی تصور کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور آخر تک اس پر کاربند رہے۔ یورپ میں علامہ اقبال کا زیادہ تر وقت کیمبرج میں گزرا۔ ۱۹۰۷ء میں علامہ ہائیڈل برگ منتقل ہو گئے۔

یورپ میں قیام کا تین سالہ زمانہ عملی اور علمی حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ یورپ جانے سے قبل بھی مشرقی مزاج کے حامل تھے' یورپ میں بھی ان کی مشرقیت قائم رہی اور واپسی کے بعد تو بالکل مشرقیت میں رنگے گئے۔ مغرب زدگی کا شکار تو وہ کبھی بھی نہ رہے۔ انھوں نے یورپ کے ظاہری حسن و جمال کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا' اور اس کے باطنی رویوں پر بھی گہری نظر ڈالی۔ ان کی نگاہ چوں کہ مدینہ و نجف کے سرمے سے مستنیر تھی' اس لیے یورپ کی رنگارنگی اسے خیرہ نہ کر سکی۔ جاوید اقبال نے لکھا ہے:

''انھوں نے یورپ کے ظاہری حسن کا تماشا ضرور کیا' لیکن ساتھ ہی اس کے باطن پر بھی گہری

نگاہ ڈالی۔ عقلی علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی کی کرشمہ سازیاں دیکھیں، مگر ساتھ ہی مشاہدہ کیا کہ یورپی علم و ہنر کا منتہائے نظر تن ہے من نہیں، یعنی یورپ میں دماغ کی تربیت تو ہو جاتی ہے لیکن دل تشنہ رہ جاتا ہے۔ یورپ کی زیرکی کی بنیاد مادہ پرستی پر رکھی گئی تھی، اس کا نصب العین مفاد اندوزی تھا اور وہ اس جذبۂ عشق سے محروم تھی جو روح کے اندر حقیقی معنوں میں احترام آدمیت یا انسان دوستی کا اخلاقی تقاضا ہے اور ارتقائے حیات کا ضامن ہے، اس لیے ان کی مشرقی بصیرت نے بھانپ لیا کہ یورپ کی تہذیب میں خرابی کی صورت مضمر ہے اور اس کی تجلی عارضی نوعیت کی ہے۔''(۱۸)

سعشہ خان نے بالکل بجا لکھا ہے کہ:

''ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس باب میں جہاں اقبال کے فکری ارتقا پر بحث کی ہے، وہاں اقبال کی جذباتی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ میں عطیہ فیضی جیسی پڑھی لکھی خاتون کی رفاقت نے اقبال کو جذباتی سہارا دیا۔ اس کی اقبال کو یورپ کے ماحول میں سخت ضرورت بھی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس رفاقت کو خواہ مخواہ فلمی بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں جاوید اقبال کی ذرا سی لغزش سے اقبال کی سوانح کی تصویر مسخ ہوسکتی تھی۔ علامہ اقبال کے بعض سوانح نگاروں نے اقبال کی اس رفاقت کو غیر ضروری طور پر رنگین بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن جاوید اقبال نے بہت احتیاط سے اقبال کے اس جذباتی دور کا بیان کیا ہے۔''(۱۹)

اس سلسلے میں جاوید اقبال نے عطیہ فیضی کی اس قسم کی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے، جیسے:

''اقبال نے اپنے تحقیقی مقالے کے کچھ حصے عطیہ کو پڑھ کر سنائے اور اُن کی رائے طلب کی۔ بعد میں عطیہ فیضی انھیں امپیریل انسٹی ٹیوٹ لے گئیں۔''(۲۰)

زندہ رُود کی پہلی جلد کا اختتام یورپ سے واپسی پر ہوتا ہے۔ اس جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر اُسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے:

''لہجے کی متانت، رویے کی سلاست روی، معروضی انداز فکر، حزم و احتیاط اور تناسب باطنی کا لحاظ اس تالیف کی نمایاں خصوصیات ہیں۔''(۲۱)

(۵)

زندہ رُود (جلد اوّل) کے مندرجات پر ابواب وار بحث کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر اس جلد پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے جیسا کہ

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ زندہ رُود کو علامہ کی سوانح عمریوں میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے' مگر اس قدر ممتاز اور منفرد ہونے کے باوجود زندہ رُود کو حیاتِ اقبال پر حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں بھی فکری' تحقیقی' سوانحی اور لسانی نوعیت کے تسامحات موجود ہیں اور پھر زبان اور انداز بیان اس قدر سہل اور سادہ ہے کہ اس میں جاذبیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ پوری جلد میں دو چار مقام ایسے آئے ہیں کہ جہاں تحریر میں تازگیء اظہار کا احساس ہوتا ہے' ورنہ ہر جگہ اُسلوب کا کھردرا پن نمایاں ہے۔ زندہ رُود کی تیسری اشاعت پیشِ نظر ہے' مگر پہلے ایڈیشن اور مابعد کی اشاعتوں میں کسی طرح کی کوئی حک و اصلاح نہیں کی گئی۔ پہلی اشاعت میں در آنے والے تسامحات تیسری اشاعت میں بھی موجود ہیں۔ اس جلد کی چند ایک غلطیاں ملاحظہ ہوں:

(۱) بابا لول حج کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال ابو محمد حاجی محی الدین مسکین کی کتاب تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار سے اقتباس نقل کرتے ہیں کہ:

''ولادتش در موضع چکوحلبند پرگنہ آدون بود۔ ہر دو چشم و پایش کج بودند۔ پس ویرا داعیہ تزویج بظہور آمد و بازنی عقد نکاح بربست چوں منکوحہ اش صورت ویرا بدید بجندید دل بابا از وی متنفر گردید۔ پس کمر ہمت بربستہ برآمد' سفر زیارت حرمین شریفین نمود و پس از تشریف یابی بزیارت مبارک چوں رحلت کرد در مقبرہ مرشد آسود و بعضی نوشتہ اند کہ در قریہ زالرہ پرگنہ کا مراج مدفون است''(۲۲)

بابا لول حج کے بارے میں جس اقتباس کو ان کے احوال و آثار کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے، وہ داخلی حوالے سے خود ان کے خلاف جا رہا ہے۔ فاضل مصنف نے اس جانب توجہ نہیں دی اور مذکورہ بالا اقتباس کو بہ طور سند استعمال کیا ہے۔ مثلاً: وہ لکھتے ہیں کہ بابا لول حج کو لول حج اس لیے کہتے ہیں کہ انھوں نے بہت سے حج کیے اور پیادہ دُنیا کی سیاحت کرتے رہے۔ حالاں کہ پیشِ نظر اقتباس میں بتایا گیا ہے کہ وہ آنکھوں سے اندھے اور پاؤں سے معذور تھے۔

۱) ایک معذور آدمی کس طرح پیادہ پا حج و سیاحت دُنیا میں مگن رہ سکتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے' ہمارے فاضل مصنف نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

۲) یہ کہ'' بازنی عقد نکاح بربست چوں منکوحہ اش صورت ویرا بدید بجندید دل بابا از وی

تنفر گردید‘‘..... سے سلسلۂ اولاد چلتا دکھائی نہیں دیتا‘ جہاں بیوی دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتی ہو‘ وہاں سلسلۂ نسب کی تحفیظ معلوم؟

(۲) ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے:

’’رشی، بجائے خود کوئی ذات یا گوت نہیں، بل کہ زہاد کا طبقہ تھا جسے اس نام سے پکارا جاتا تھا۔ ان میں کھشتری، راجپوت، برہمن، ویش، میر اور بٹ ذاتوں کے افراد شامل تھے مگر اکثریت ایسے صوفیہ کی تھی جو اپنا روایتی مذہب ترک کر کے دائرہ اسلام میں آئے تھے۔ رشی سنسکرت میں تارک الدُنیا اور مشغول بہ یادِ خدا کو کہتے ہیں۔‘‘(۲۳)

رشی مونی ہندوؤں میں تو ہو سکتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں‘ کسی مسلمان سلسلۂ صوفیہ کو سلسلۂ رشیاں نہیں کہا جاتا۔ تمام سلاسل تصوف کے شجرے موجود ہیں، ان سے اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ہندو جوگی تو رشی ہو سکتا ہے‘ مسلمان صوفی رشی نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں تصوف کی ہزار بارہ سو سالہ تاریخ میں کوئی صوفی رشی نہیں رہا اور نہ ہی کہلایا‘ تو پھر بابا لول حج کے سلسلۂ ارادت وعقیدت کو رشیوں سے منسوب کرنا کہاں کا انصاف ہے۔

(۳) ’’۱۷۹۹ء میں میسور میں سلطان ٹیپو کی انگریزوں کے مقابلے میں شکست نے مسلمانانِ ہند کی اپنی زوال پذیر اجتماعی سیاسی قوت کے احیا اور بحالی کے لیے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔‘‘(۲۴)

سلطان شہید کی شکست اور شہادت سرنگاپٹم میں ہوئی‘ میسور میں نہیں۔

(۴) ’’۱۸۵۷ء کی بغاوت دراصل بنگالی فوج کی سرکشی تھی۔‘‘(۲۵)

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ شاعرِ مشرق‘ حکیم الامت اور مفکرِ پاکستان کی سوانح عمری میں جنگِ آزادی کو ’بغاوت‘ کا نام دیا جائے۔

(۵) ’’انجمن ترقی اُردو، اقبال نمبر، مطبوعہ ۱۹۳۸ء۔‘‘(۲۶)

انجمن ترقی اُردو کسی اخبار یا رسالے کا نام نہیں‘ کہ اس کا اقبال نمبر چھپا ہوگا۔ یہ ایک ادارہ ہے‘ اس کے تحقیقی پرچے کا نام اردو ہے، جس نے اقبال نمبر شائع کیا تھا۔

(۶) ’’۱۹۷۰ء میں خطبات الاحمدیہ (سیرت طیبہ پر مضامین کا مجموعہ) شائع ہوئی۔‘‘(۲۷)

خطبات الاحمدیہ سر ولیم میور کی کتاب *Life of Muhammad* کا جواب ہے۔ یہ صرف سیرت کے مضامین کا مجموعہ نہیں۔

(۷)''۱۸۹۸ء میں وجاہت حسین جھنجھانوی کے قومی ماتم میں بھی انھیں تلمیذ حضرت داغ کہا گیا۔''(۲۸)

یہ قومی ماتم کیا ہوا۔ایک فرد کی موت 'قومی ماتم' کیسے ہوسکتی ہے۔

(۸)''پس قدرت کے بوئے ہوئے بیج میں پھلنے پھولنے کی اہلیت تو تھی، کیوں کہ اس کی آبیاری ہوچکی تھی، لیکن کلی کا پھول بن کر کھلنا ابھی باقی تھا۔''(۲۹)

غنچہ کھل کر پھول بنتا ہے۔کلی تو پھول بننے کے بعد کی چیز ہے، وہ کیوں کر کھل سکتی ہے اور کلی کا پھول سے تعلق جزو اور کل کا ہے، اجمال اور تفصیل کا نہیں۔

(۹)ص ۷۶ پر حوالہ ٹھیک نہیں، چھٹے اقتباس کے بعد آٹھواں اقتباس موجود ہے، ساتویں کا کہیں ذکر نہیں۔

(۱۰)''بہر حال طالب علمی کے زمانے میں اقبال کی بعض غزلیں چند رسالوں مثلاً زبان دہلی، شورِ محشر وغیرہ میں شائع ہوئیں۔''(۳۰)

چند رسالوں کا مطلب دو نہیں ہوتا۔

(۱۱)''مقابلہ ناکامل دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے۔''(۳۱)

ناکامل دستکار کون سے ہوتے ہیں، کامل کا متضاد خام کار ہے، ناکامل نہیں۔

(۱۲)''جب احباب کی محفلیں جمتیں اور سلسلۂ شعر وسخن شروع ہوتا تو علی بخش چولہا گرم رکھتا، تاکہ اقبال کا حقہ ساعت بہ ساعت تیار کرتا رہے۔''(۳۲)

چولہے کے گرم ہونے کا حقے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

(۱۳)''بیرسٹری کے امتحانوں کے لیے بھی کسی نہ کسی ان میں ٹرمیں پوری کرنے کی خاطر داخلہ کی ضرورت تھی۔''(۳۳)

امتحان سے بات مکمل ہوسکتی تھی، امتحانوں کی ضرورت نہ تھی، اس نوعیت کی بے اعتدالیاں ہر صفحے پر موجود ہیں۔

(۱۴)''کہا جاتا ہے کہ اقبال نے کیمبرج سے بی اے کی ڈگری لی۔''(۳۴)

کہا جاتا ہے، جیسے الفاظ تحقیق وتدقیق کی ثقاہت کو کم کر دیتے ہیں۔

(۱۵)اس جلد میں سو سے زائد بار 'دوران' کا لفظ آیا ہے اور کسی ایک مقام پر بھی اس کے ساتھ ''میں'' نہیں ہے، حالاں کہ قواعد کی رو سے یہ غلط ہے۔ جن تسامحات کا تذکرہ کیا گیا' یہ نمونہ مشتے از خروارے ہے، ورنہ زندہ رُود میں اس نوعیت کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اچھا خاصا 'ذخیرہ' موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱- پیش لفظ زندہ رُود جلد اوّل' جاوید اقبال: لاہور' شیخ غلام علی اینڈ سنز' بار سوم ۱۹۸۵ء: ص الف
۲- ایضاً، ص ا-ب
۳- ایضاً، ص ج
۴- ایضاً، صج-د
۵- تبصرہ بر زندہ رُود مشمولہ ششماہی نقد و نظر، اقبال نمبر' علی گڑھ' شمارہ نمبر۲' جلد۴' ۱۹۸۲ء: ص ۲۶۹
۶- پیش لفظ، زندہ رُود: جلد اول، ص د
۷- زندہ رُود جلد اول: ص ۳
۸- ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات 'سعشہ خان: لاہور: سورج پبلشنگ ہاؤس' ۱۹۹۵ء: ص ۱۶۱-۱۶۲
۹- زندہ رُود جلد اول: ص ۱۱
۱۰- روز گار فقیر' جلد دوم: ص ۱۱۵-۱۱۶
۱۱- ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات: ص: ۱۶۳
۱۲- زندہ رُود جلد اول: ص ۱۷-۱۸
۱۳- ایضاً، ص ۵۰
۱۴- ایضاً، ص ۷۳
۱۵- ایضاً، ص ۷۷
۱۶- ایضاً، ص ۸۹
۱۷- ایضاً، ص ۹۵-۹۶

۱۸- ایضاً،ص۱۲۹
۱۹- ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات :ص۱۷۸-۱۷۹
۲۰- زندہ رُود (جلداول):ص۱۸۴
۲۱- نقد و نظر ،اقبال نمبر:ص۲۷۰
۲۲- زندہ رُود جلداول:ص۳
۲۳- ایضاً،ص۷
۲۴- ایضاً،ص۲۰
۲۵- ایضاً،ص۲۵
۲۶- ایضاً،ص۳۱
۲۷- ایضاً،ص۵۳
۲۸- ایضاً،ص۷۱
۲۹- ایضاً،ص۷۳
۳۰- ایضاً،ص۸۵
۳۱- ایضاً،ص۸۹
۳۲- ایضاً،ص۹۳
۳۳- ایضاً،ص۱۱۳
۳۴- ایضاً،ص۱۱۳

☆☆☆☆☆

زندہ رُود

جلد دوم کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

زندہ رُود جلد دوم ایک سوانہتر (۱۶۹) صفحات پر مشتمل ہے۔ مسلسل صفحات ۱۳۹ تا ۳۰۸ ہیں۔ یہ جلد سات ابواب (آٹھ تا چودہ) کو محیط ہے۔ اس میں حیاتِ اقبال کے وسطی دور کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے۔ بہ قول ڈاکٹر جاوید اقبال:

''اس حصے کا آغاز ستمبر ۱۹۰۸ء یعنی اقبال کی دُنیا دارانہ جدوجہد سے ہوتا ہے اور دسمبر ۱۹۲۵ء تک کی مدت میں ان کے بہ تدریج ارتقا کے جائزے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس دور میں اقبال نے ملت اسلامیہ کے لیے نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنے کی غرض سے اپنے خیالات کا برملا اظہار کرنا شروع کیا اور حقیقی اسلامیت کی بیداری کی خاطر ایک مخصوص نظام فکر کی تدوین کی۔ نتیجہ میں نہ صرف ان کے افکار پر کڑی تنقید کی گئی' بل کہ ان کے مخالفین نے اقبال کی کردار کشی کی مہم کا بھی آغاز کیا۔ ان کی ذات کے متعلق مختلف قسم کے بہتان تراشے گئے اور مسلمانوں کو خودی کا احساس دلا کر ایک ملت یا قوم کی صورت میں متحد کرنے والی شخصیت پر کفر کا فتویٰ بھی صادر کیا گیا۔''(۱)

علامہ اقبال ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے' تو انھوں نے باقاعدہ طور پر عملی زندگی میں قدم رکھا۔ اگرچہ وہ ایم اے کرنے کے بعد اور یورپ جانے سے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج میں درس و تدریس سے وابستہ رہے' مگر عملاً وہ زندگی کی جدوجہد میں ۱۹۰۸ء کے بعد ہی شریک ہوئے۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۵ء تک کے سترہ (۱۷) سال اقبال کی زندگی کے نہایت اہم دورانیے کو محیط ہیں۔ عملی اور فکری حوالے سے بھی یہ زمانہ خاصا ہنگامہ خیز رہا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت ہوئی۔ اس کتاب کے منصۂ شہود پر آتے ہی

برصغیر کے متصوفانہ اور خانقاہی حلقوں میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ حسن نظامی نے اخبارات و رسائل کے ذریعے فکرِ اقبال کے خلاف کام کا آغاز کیا۔ اقبال اور اُن کے حامیوں نے بھی جواب دیے۔ یوں یہ سلسلہ تین سال جاری رہا اور بعد میں کہیں جا کر سرد پڑا۔ ۱۹۰۸ء اور ۱۹۲۵ء کے مابین ہی کئی ایک دیگر اہم کام سامنے آئے، مثلاً:

(۱) اقبال کا پہلا مجموعۂ اردو بانگِ درا کے عنوان سے چھپا۔

(۲) بانگِ درا کی اشاعت سے قبل حیدر آباد دکن سے مولوی عبدالرزاق نے کلیاتِ اقبال کے عنوان سے ان کا تمام اُردو کلام چھاپ دیا۔ اس کی اشاعت علامہ کو ناگوار گزری، لہٰذا سر اکبر حیدری اور کشن پرشاد شاد کی وجہ سے اس کی اشاعت حیدر آباد کے علاقے سے باہر نہ ہوئی اور یہ مجموعہ اس علاقے تک محدود رہا۔ اس کے مرتب نے بہ طور رائلٹی، ہر جانہ ایک ہزار روپے علامہ کو ادا کیے۔

(۳) مولوی احمد دین نے اقبال کے نام سے کتاب ترتیب دی اور اس میں علامہ کا اُردو کلام بھی چھاپا، مگر بعد میں بانگِ درا کی طباعت واشاعت کی وجہ سے یہ کتاب ضائع کر دی گئی۔

جاوید اقبال نے اس جلد میں بھرپور انداز سے علامہ اقبال کی زندگی اور اس کے واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے سوانحی پس منظر میں برصغیر کے مخصوص سیاسی، سماجی، معاشرتی اور فکری ماحول کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سوانح کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے احوال و واقعات اور اقبال کی معاصر شخصیات کا رنگ روپ بھی ان کے مجموعی خدوخال کے تناظر میں نمایاں ہو کر ابھرا ہے۔ یہ سوانح اقبال کے احوال و آثار کا تذکرہ ہی نہیں، مسلمانوں کے حالات کا آئینہ بھی ہے۔ ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک کے حالات و واقعات کی تصویر کشی جاوید اقبال نے حسبِ ذیل عنوانات / ابواب کے تحت انجام دی ہے۔ اور آخر میں ان مراجع کی نشاندہی کی ہے، جو سوانح نگاری کے دوران میں ان کے پیشِ نظر رہے ہیں۔

۱- فکرِ معاش

۲- ازدواجی زندگی کا بحران

۳- ذہنی ارتقا

۴۔تخلیقی کرشمہ
۵۔قلمی ہنگامہ
۶۔خانہ نشینی
۷۔ہندو مسلم تصادم کا ماحول

زندہ رُود کی جلد دوم کے محاسن ومعائب کا تذکرہ کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک باب کے مندرجات کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جائے اور دیکھا جائے کہ ڈاکٹر صاحب نے کن کن واقعات کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔

۱) 'فکر معاش' کے عنوان سے اس جلد کا پہلا باب تحریر کیا گیا ہے۔زندہ رُود کے مجموعی تسلسل میں اس باب کا نمبر آٹھ ہے اور یہ بائیس صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں بعض واقعات کا زمانی ترتیب سے ذکر کیا گیا ہے' جب کہ کچھ واقعات غیر زمانی ترتیب سے بھی در آئے ہیں۔علامہ اقبال نے اس دورانیے میں علمی اور فکری حوالے سے جو کام کیا' اس کی خاصی تفصیل فراہم کی گئی ہے' مگر کئی ایسے واقعات کا ذکر نہیں' جو اس زمانے میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔۱۹۱۳ء تک علامہ نے انجمن حمایت اسلام اور کئی دیگر فورم سے جو نظمیں سنائیں اور لیکچر ارشاد فرمائے' ان کا تذکرہ موجود ہے' مگر مقام حیرت ہے کہ ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ میں علامہ اقبال نے جو خطبہ دیا' اس کا ذکر نہیں کیا گیا' اس کے علاوہ بھی کچھ واقعات' جن کا زمانی حوالے سے الگ باب میں تذکرہ ہونا چاہیے تھا' وہ نہیں ہوا۔نظم 'شکوہ' ۱۹۱۱ء میں انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم سے سنائی گئی۔اس کی قرات اور اشاعت کے بعد بعض علما کی طرف سے اس کے مندرجات پر جو اعتراضات ہوئے اور علامہ کے خلاف کفر کے فتوے دیے گئے' ان کا ذکر یہاں مذکور نہیں' حالاں کہ ضروری تھا کہ اس کی تفصیل بھی بیان کر دی جاتی۔علامہ کی علمی اور فکری فتوحات کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی زندگی کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے مگر ضروری کوائف نہیں دیے گئے۔انھوں نے بعض مقامات پر بہت اختصار سے کام لیا ہے' جس کی وجہ سے اُلجھنیں پیدا ہو گئی ہیں، مثلاً: ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''اس دور میں اقبال نے چند انگریزی مقالات بھی تحریر کیے' جن کا جائزہ مناسب مقام پر لیا جائے گا۔''(۲)

(۱) زمانی حوالے سے تو مناسب مقام یہی تھا کہ اسی جگہ ان مقالات کا تذکرہ کیا جاتا اور اُن مقالات کی تفاصیل فراہم کی جاتیں، تاکہ فکرِ اقبال کے ارتقا میں ان مقالات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوسکتا' بعد میں وہ مناسب مقام' پورے باب میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

(۲) اقبال نے گورنمنٹ کالج میں پروفیسری چھوڑ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا' مگر اس کی تفصیل نہیں دی گئی' کہ آیا یہ پیشہ ذریعۂ معاش، اقبال کے لیے کس حد تک آسودگی کا باعث رہا اور علامہ کہاں تک اس سے مطمئن رہے؟ ان کی آمدنی کتنی تھی اور اخراجات کی کیا شرح رہی' حالاں کہ خطوطِ اقبال سے یہ کوائف مرتب ہو سکتے تھے' مگر ان ماخذات سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

(۳) اس اختصار نویسی کی بنا پر مختلف نوعیت کی تحقیقی' سوانحی اور لسانی غلطیاں در آئیں۔ مثلاً:

(ا) جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اقبال نے قیام یورپ کے دوران غالباً ۱۹۰۷ء کے آخری حصہ میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔''(۳)

انھیں مغالطہ ہوا' علامہ نے استعفا ۱۹۰۷ء میں نہیں دیا تھا' بل کہ انھوں نے یہ استعفا ۱۹۰۸ء میں ماہ جنوری کی ۳۱/تاریخ کو دیا۔(۴)

(ب) اسی سلسلے میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''۳۰/اکتوبر ۱۹۰۸ء سے اقبال کی بحیثیتِ ایڈووکیٹ انرولمنٹ ہوگئی۔''(۵)

یہ تاریخ بھی صحیح نہیں، ۳۰/اکتوبر کے بجائے علامہ کی انرولمنٹ دس دن قبل ۲۰/اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ہوئی۔(۶)

(ج) ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''انھوں نے لالہ رام پرشاد پروفیسر تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے نصابی کتاب تاریخ ہند مرتب کی' جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔''(۷)

یہ بات غلط ہے' کہ اقبال نے یہ کتاب مرتب کی اور اس میں لالہ رام پرشاد بہ طور

مشترک مرتب شریک رہے' لالہ تاریخ کے پروفیسر تھے' یقیناً انھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہوگی' اور محض تبرکاً علامہ اقبال کا نام استعمال کیا ہوگا۔

(د) ''نیز اپنے افکار ایک بیاض میں نوٹوں کی صورت میں جمع کرنے شروع کیے۔''(۸)

اُردو میں نوٹس کا لفظ مستعمل ہے۔''نوٹوں'' سے ذہن بجائے نوٹس کے روپوں' کی طرف منتقل ہوتا ہے' یا تو جملے میں نوٹس کا لفظ آنا چاہیے تھا یا پھر جملے کی تشکیل ٹھیک طرح ہونی چاہیے تھی، موجودہ صورت میں قواعد زبان کے مطابق یہ جملہ درست نہیں۔

(ر) جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''زبان سے ایسے ایسے لطیف فقرے چست ہو جاتے یا ایسی دلفریب پھبتیاں نکلتیں۔''(۹)

اس جملے میں 'زبان سے فقروں کا چست ہونا' اور 'پھبتیوں کا نکلنا' خلاف محاورہ ہے۔

(س) ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''ان کا جذب دروں 'شکوہ' جیسی معرکتہ الآرا نظم کی صورت میں پھوٹ پڑا۔''(۱۰)

اس جملے میں 'معرکتہ الآرا نظم' کی ترکیب غلط ہے' اسے معرکہ آرا ہونا چاہیے' دوسرا پھوٹ پڑنا' محاورہ ہے' اور اس کے معنی جھگڑا ہو جانے کے ہیں' پھوٹ نکلا' صحیح تھا' مگر اس جانب فاضل مصنف کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔

۲) جلد دوم کے دوسرے باب کا عنوان ہے:'ازدواجی زندگی کا بحران' جو مجموعی تسلسل میں نواں باب ہے اور ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں جاوید اقبال نے موضوع سے بہت کم انصاف کیا ہے' دو تین صفحات پر ازدواجی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے بعد' وہ دیگر معاملات کی طرف نکل گئے اور اقبال اور اُن کے معترضین کی بحث میں اُلجھ کر رہ گئے، حالاں کہ مختلف کتب و رسائل میں علامہ کی ازدواجی زندگی سے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ اس کے پس منظر میں نہایت توانا اور جان دار باب لکھا جاسکتا ہے، لیکن جاوید اقبال نے موضوع زیر بحث پر زیادہ توجہ مبذول نہیں فرمائی اور ادھر ادھر کی باتوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ پیشِ نظر مواد کے باعث اگر اس باب کا عنوان اقبال اور اُن کے معترضین' ہوتا' تو مناسب رہتا' کیوں کہ اس

باب کا تین چوتھائی لوازمہ اس سے متعلق ہے۔ وہ بعض اوقات ایسے مسائل چھیڑ لیتے ہیں جو بعد میں اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچ پاتے اور کہیں درمیان میں ہی اُلجھ کر رہ جاتے ہیں اور یوں یہ مسئلہ زیر بحث پر تفصیل فراہم کرنے یا پھر قاری کی تشفی کرنے کے بجائے اس کے لیے اُلجھن اور مغالطے پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً:

(ا) ''راقم اس معاملہ میں تبصرہ کرنے والوں کی معقولیت یا نامعقولیت پر اس لیے بحث کرنا نہیں چاہتا کہ وہ محض قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں''۔(۱۱)

(ب) ''راقم اس پوزیشن میں نہیں کہ اقبال کو قریب سے جاننے والوں کی آرا پر کوئی تبصرہ کر سکے''۔(۱۲)

لیکن کیوں؟ مختلف اور متضاد آرا سے محقق کا حقائق تک پہنچ جانا مشکل سہی، ناممکن نہیں ہوتا، پھر جاوید اقبال اتنے بے بس کیوں معلوم ہوتے ہیں کہ وہ اقبال کو 'قریب سے جاننے والوں کی آرا' پر تبصرہ نہیں کرتے یا کر نہیں پاتے حالاں کہ اقبال کے ان معاصرین کی متضاد اور متناقض آرا سے صداقت کو پا لینا اتنا ناممکن بھی نہیں، کیوں کہ ان کی اقبال مخالف تحریروں کے بین السطور بہرحال سچائی اپنے ہونے کا احساس رکھتی ہے، بس اس سچائی کو تلاش کرنے کی ضرورت تھی، مگر جاوید اقبال بوجوہ اس پوزیشن میں نہ تھے اور یوں سچ کی نقاب کشائی نہ ہو سکی اور اقبال پر لگائے گئے الزامات رفع نہ ہو پائے۔ پچھلے باب کی طرح اس باب میں بھی واقعات کے زمانی تقدم وتاخر کا خیال نہیں رکھا گیا۔ بعض واقعاتی مغالطے درآئے اور زبان واملا کے اغلاط بھی۔ مثلاً:

(ا) صفحہ ۷۰ پر انھوں نے مولانا دیدار علی کے فتوے کا ذکر کرنے کے فوراً بعد یہ لکھا ہے:

''بہرحال کانگریسی ذہنیت رکھنے والے علما کا اقبال سے تنازعہ ختم نہیں ہوا''۔(۱۳)

بوجوہ مولانا دیدار علی اقبال کی مخالفت میں پیش پیش رہے، اول اول انھوں نے اقبال پر کفر کا فتویٰ لگایا، مگر انھیں کانگریسی علما کے ساتھ بریکٹ کرنا کئی طرح کے مغالطوں کا پیش خیمہ ہے۔ ان کی اقبال مخالفت اپنی جگہ مگر انھیں کانگریسی دھڑے میں شامل کرنا بہت بڑی تحقیقی غلطی ہے۔ وہ بریلوی مسلک کے عالم تھے، ان کا کانگریس سے کچھ تعلق نہ تھا، پھر اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ علامہ کے اختلاف کا اس باب میں ذکر کچھ بے محل

اور بے جوڑ دکھائی دیتا ہے۔

(۲) ''اس لیے وہ بیشتر وقت والدین کے ساتھ یا اپنے میکے گجرات میں بسر کرتی تھیں اور بعض اوقات چند ماہ کے لیے سیالکوٹ آ جاتیں۔''(۱۴)

اس جملے کے یہ الفاظ' والدین کے ساتھ یا اپنے میکے' مغالطے کا باعث ہیں' والدین ہی میکہ ہوتے ہیں' وہ جہاں بھی ہوں' اپنے آبائی شہر میں یا کسی دوسری جگہ بیٹی کے لیے وہ جگہ میکہ ہوتی ہے۔ پھر میکہ اور والدین میں لفظ ''یا'' کس معنویت کی وضاحت کرتا ہے؟

(۳) جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

''اپنی بھتیجیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے یا کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑاتے۔''(۱۵)

یہاں لفظ کوٹھا ''چھت'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چھت کا لفظ مناسب تھا' کیوں کہ ''کوٹھے'' کا مفہوم وسیع ہے اور اپنے بعض معنوی حوالوں سے مذموم بھی۔

(۴) ''مردانے میں پہلے کی طرح اقبال کے احباب کی محفلیں لگتیں اور گرمیوں کی تعطیلات میں سب سیال کوٹ چلے جاتے اور وہاں رونق لگتی''۔(۱۶)

محفل اور رونق کے ساتھ ''لگنا'' بے معنی' غلط اور بھدا ہے اور قواعد زبان کے خلاف بھی۔

(۵) اس باب میں برات کو بارات(۱۷) موقع کو موقعہ(۱۸) سنہ کو سن (۱۹) اور تنازع کو تنازعہ(۲۰) لکھا گیا ہے۔ اسی طرح دوران کے ساتھ 'میں' کا استعمال نہیں کیا گیا۔

۳) جلد دوم کا تیسرا باب ''ذہنی ارتقا'' سے متعلق ہے۔ اس باب کا مسلسل نمبر دس ہے اور صفحات کی کل تعداد اٹھارہ ہے۔ یہ باب اقبال کے ذہنی ارتقا سے بحث نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں عہد بہ عہد اقبال کے ذہنی ارتقا کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اصل میں یہ باب اقبال کے ایک مضمون ''قومی زندگی'' اور چند خطبات کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے' تو کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہ باب اقبال کی مذکورہ تحریروں کے خلاصے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں زیادہ تر اقبال کی تحریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں' کوٹیشنز کے علاوہ بقیہ جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ بھی اقبال کی تحریروں کی تلخیص ہی ہے۔ مثلاً: دیکھتے ہیں کہ اس باب میں کن موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے اور اقبال کے ذہنی

ارتقا میں ان موضوعات نے کیا حصہ لیا ہے:

۱-عورتوں کی تعلیم

۲- پردہ

۳- شادی بیاہ کی رسومات

۴- اقبال کا ملی تصور

۵- اسلامی تہذیب وتمدن

۶- موت وحیات کا فلسفہ

۷- اسلامی ریاست کا اُصولِ انتخاب

۹- نظریۂ شاعری

ظاہر ہے کہ یہ آٹھ موضوعات اقبال کے نظام فکر وفلسفہ میں اہم ضرور ہیں، لیکن ان کی حیثیت بنیادی اور مرکزی نہیں ہے' کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ذہنی ارتقا کے ضمن میں علامہ کے جن افکار کو موضوع بحث بنایا گیا' ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ان کی فکر کا بنیادی نکتہ نہیں ہے، پھر یہ بھی کہ اس باب میں کلام اقبال اور جدید تشکیل الہیات اسلامیہ کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ کلام اقبال' خطبات اور دیگر تحریروں کے بغیر کس طرح اقبال کے ذہنی ارتقا کو سمجھا جاسکتا ہے' پھر یہ بھی کہ اس باب میں زمانی تقدم وتاخر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ یہ باب اس پوری کتاب کا کمزور ترین باب ہے' جو اقبال کی سوانح اور فکری شخصیت کی تشکیل میں کسی خوش کن منظر کا اظہار یہ نہیں بنتا۔

۴) جلد دوم کا چوتھا باب بہ عنوان 'تخلیقی کرشمہ' ہے۔ اس کا مسلسل نمبر گیارہواں ہے اور یہ ۱۹ صفحات کو محیط ہے۔

'تخلیقی کرشمہ' میں اسرارِ خودی کی تحریر وتسوید اور طباعت واشاعت کا حال بیان ہوا ہے مگر نہایت اختصار کے ساتھ، حسبِ معمول اس باب میں بھی فاضل مصنف نے موضوع کو پیشِ نظر نہیں رکھا' انھوں نے ابتدائی دو تین صفحات میں اسرارِ خودی کی تحریر وترتیب کا تذکرہ کیا مگر بعد کے تمام تر صفحات دیگر حالات وواقعات سے معمور ہیں۔ پیشِ نظر مسئلے کے کئی قضیے

حل نہیں کیے گئے۔ یہ باب اور اس سے متصل پانچواں باب 'قلمی ہنگامہ' ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ اس مسئلے پر دو ابواب مرتب کرنے کے بجائے ایک ہی باب میں سمویا جاسکتا تھا اور دوسرا یہ کہ پیشِ نظر مسئلے کے تمام تر پہلوؤں پر یک جا گفتگو ہو جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا مگر فاضل مصنف نے ایک ہی مسئلے پر دو ابواب باندھے اور دونوں باب پیشِ نظر مسئلے کے بارے میں کفایت نہیں کرتے۔ پھر یہ بھی کہ تکرار بے پناہ ہے۔ تخلیقی کرشمے میں جن معاملات کو زیر بحث لانا چاہیے تھا' وہ وہاں موجود نہیں' بعض ایسے واقعات آئے ہیں' جو زمانی ترتیب سے بالکل غلط اور دور از کار ہیں۔ صفحہ ۲۰۷ پر سرسیّد علی امام کے نام اسرارِ خودی کے انتساب کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے، وہ لکھتے ہیں:

''سیّد علی امام کو عربی، فارسی اور اُردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ الولدسر' لابیہ، ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد ادبیات اُردو میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے ہندو و مسلمان نمائندے شاید سات آٹھ ہیں۔ راجہ نرندر ناتھ صاحب بھی اسی جہاز میں ہیں۔ چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں مغرب زدہ، مغرب زدہ مسلمان کی اصطلاح (جو) شاید معارف نے وضع کی تھی، نہایت پر لطف ہے لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلہ کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظ قرآن ہیں یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین، مقدم الذکر ہر روز ورد کرتے ہیں اور سنا ہے ہر سال تراویح بھی پڑھاتے ہیں۔ سیّد علی امام کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشۂ جہاز پر کھڑے تھے، میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے دیکھو بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ ان کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار ہو کر بولے، بلغ سلامی روضتہ فیہا النبی المحترم، ان کے قلب کی کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا میں، مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی''۔ (۲۱)

حیرت ہے کہ سرسیّد علی امام سے تعلقات کی وضاحت کے لیے ۱۹۳۱ء میں جہاز کے سفر کو استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں چھپنے والی کتاب اور اس کے انتساب کی وضاحت

کے لیے ۱۹۳۱ء میں سفری تعلقات..... چہ خوب!

۵) پانچویں باب کا عنوان ہے 'قلمی ہنگامہ' جو مسلسل بارہواں باب ہے اور ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسرارِ خودی کی اشاعت پر جو ہنگامہ رونما ہوا' اس باب میں اس کی تفصیل مرتب کی گئی ہے۔ جسٹس جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعت پر وجودی تصوف کے حامی صوفیوں' روایتی سجادہ نشینوں' عہد تنزل کی شاعری کے دلدادوں اور فرسودہ یونانی فلسفۂ اشراق کے پیروکاروں کی اقبال اور اس کے حامیوں کے ساتھ جو قلمی جنگ ہوئی وہ ۱۹۱۵ء کے اواخر سے لے کر ۱۹۱۸ء یعنی تقریباً ڈھائی تین برس تک جاری رہی۔ اس قلمی ہنگامے کی پوری تفصیل اقبال کی کسی تحریر کردہ سوانح عمری میں ملتی ہے نہ ان کتب میں جو اقبال اور تصوف کے موضوع پر لکھی گئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سالوں میں بیسیوں مضامین مختلف اخباروں اور رسالوں میں مثنوی اسرارِ خودی کی تعریف یا مخالفت میں وجودی تصوف کے حق میں یا خلاف اور حافظ کی حمایت یا ان کے نظریۂ حیات کی تردید میں شائع ہوئے۔ مشائخ میں اقبال کی مخالفت میں خواجہ حسن نظامی اور اُن کے مرید سب سے آگے تھے۔ اقبال نے خود اس بحث میں پڑ کر کئی مضامین لکھے۔ ان کے حامیوں میں مولوی سراج الدین پال ایڈوکیٹ' مولانا عبداللہ عمادی' مولانا ظفر علی خان' مولوی الف دین وکیل' مولوی محمود علی' عبدالرحمٰن بجنوری' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض ادیبوں نے اپنے نام مخفی رکھے اور کشاف' نقاد' ایک مسلمان یا مسلم فلاسفر وطبعی ایسے فرضی ناموں کے تحت مضامین لکھتے رہے۔ اس موضوع پر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور اگر ان سب مضامین کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں راقم کے پیشِ نظر عبداللہ قریشی کا تحریر کردہ ایک مضمون ہے جو حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں (معرکۂ اسرارِ خودی) کے عنوان سے اقبال مجلّہ بزم اقبال میں دو قسطوں میں شائع ہوا' اور اسی مضمون پر انحصار کرتے ہوئے غلام رسول نے اپنی تصنیف مطالب اسرار و رموز کا مقدمہ ترتیب دیا' علاوہ اس کے راقم نے عبداللہ قریشی کی ایک اور تصنیف معاصرین اقبال کی نظر میں کے خواجہ حسن نظامی اور اکبرالہ آبادی سے متعلق ابواب اور اقبال کے مکتوبات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس بحث سے متعلق اقبال کے تین مضمون مقالاتِ اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی میں محفوظ ہیں اور چوتھا انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار میں شامل کیا گیا ہے۔ گزشتہ سالوں میں عبداللہ قریشی نے بڑی محنت

کر کے اخباروں اور سالوں سے اس موضوع پر مزید مضامین اکٹھے کیے ہیں۔ سو یہ باب زیادہ تر عبداللہ قریشی کی تحریروں کی بنیاد پر ان سے بحث مباحثہ کی روشنی میں ترتیب دیا گیا۔''(۲۲)

جیسا کہ مندرہ بالا اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ جاوید اقبال کے سامنے علامہ کے تین مضامین کے علاوہ عبداللہ قریشی کے دو مضمون بھی تھے۔ ان پانچ مضامین کی روشنی میں علامہ کی علمی زندگی کے نہایت ہی اہم واقعے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے کے تمام مضامین فاضل مصنف کے پیشِ نظر نہیں رہے۔ جب تک طرفین کی تحریریں سامنے نہ ہوں' تو کیوں کر انصاف کیا جاسکتا ہے۔ اکثر و بیشتر اقبال شناسوں نے اس باب میں منصف مزاجی کا کچھ زیادہ مظاہرہ نہیں کیا' بل کہ وہ اقبال کی طرفداری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جاوید اقبال نے بھی اقبالی محققین و ناقدین کی پیروی میں مقبول عام باتوں پر اس باب کی بنیاد اٹھائی ہے۔ وحدۃ الوجود اور تصوف کے باب میں علامہ کے ہاں کئی طرح کے فکری مغالطے موجود ہیں۔ انھوں نے تصوف کو تصوف اسلامی اور عجمی تصوف کے درجوں میں تقسیم کر دیا' مگر یہ نہ بتایا کہ ان کے نزدیک اسلامی تصوف کیا ہے؟ اور عجمی تصوف کسے کہتے ہیں۔ پھر وحدۃ الوجود اور خودی کے تصورات میں بھی ان کے ہاں مغالطے موجود ہیں، ان کی وضاحت ضروری تھی' لیکن جاوید اقبال نے عرف عام میں معروف باتوں کے تذکرے کو ہی اہمیت دی ہے اور دوسرے گروہ کی تحریروں سے صرف نظر کیا ہے۔ تحقیق کے اُصولوں کے مطابق دونوں گروہوں کی تمام تر تحریروں کے مطالعے کے بعد ہی کسی نوعیت کا فیصلہ دیا جاسکتا تھا' لیکن جاوید اقبال نے اس طرف توجہ نہیں دی' اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کے مضامین مذکورہ مباحث میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ پیشِ نظر مسئلے پر گفتگو کرتے وقت انھیں نگاہ میں رکھنا بہت ضروری ہے ورنہ تصویر یک رخی بنے گی اور حقائق سامنے نہیں آئیں گے' جیسا کہ پیشِ نظر باب میں ہوا ہے۔ اس باب میں جاوید اقبال نے خودی اور اس کے مالہ وما علیہ پر گفتگو کرتے ہوئے وحدت الوجود کو فلسفۂ ویدانت کے ساتھ بریکٹ کیا ہے۔ حالاں کہ ان دونوں نظریوں میں اتنا ہی بعد ہے جتنا ہندومت اور اسلام میں ہے۔ انھیں مترادفات کے طور پر استعمال کرنا تصوف اور اس کے عناصر ترکیبی سے لاعلمی کی عکاسی کرتا ہے۔ حافظ کی کردار کشی پر علامہ کے والد گرامی بھی شکوہ سنج ہوئے'

مگر جاوید اقبال نے ان کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ حسن نظامی کے پہلو بہ پہلو گھر کی مخالفت کا ذکر بھی ضروری تھا۔ جاوید اقبال نے حافظ کے خلاف گیارہ شعر نقل کیے اور لکھا:

''اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی میں جو اشعار حافظ کے خلاف کہے اور جن پر اعتراض ہوا، وہ یہ تھے۔''(۲۳)

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ حافظ کے خلاف لکھے گئے اشعار کی تعداد گیارہ نہیں' پینتیس(۳۵) ہے' مگر یہ اس وقت معلوم ہوسکتا ہے' جب اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کا مطالعہ کیا جائے' اور محقق کی رسائی محض ثانوی مآخذ تک نہ ہو۔ اسی طرح ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل کی مثنوی سرالاسرار کا ذکر نہیں کیا گیا جو اسرارِ خودی کی مخالفت میں ۱۹۶۲ء میں مشرقی پاکستان سے کتاب کی شکل میں چھپی۔ پھر سیّد سلیمان ندوی کے اعتراضات بھی تو زیر بحث نہیں آئے' جو علامہ کی فارسی سے متعلق تھے۔ خیر حیرت کی کوئی بات نہیں' جب اس قلمی ہنگامے کے ضمن میں صرف دو مضمون پیشِ نظر ہوں تو پھر اس قسم کی تحریر وجود پذیر ہوسکتی ہے۔ اسی باب میں دو تین حوالوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام حوالے بھی اصل مآخذ سے نہیں دیے گئے' بل کہ یہ ادھر ادھر سے منقول ہیں۔ پہلی بار حوالوں میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں' وہ اس باب میں بھی راہ پا گئی ہیں۔

۶) خانہ نشینی زندہ رُود کی تیسری جلد کا چھٹا جب کہ مسلسل تیرہواں باب ہے جو ۴۱ صفحات کو محیط ہے۔ اس باب میں برصغیر میں سیاسی اور عمومی بے چینی، امن و امان کی خرابی، برصغیر کے مختلف طبقوں کے درمیان منافرت اور انگریزوں کے خلاف احتجاجی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سانحۂ جلیانوالہ باغ، خلافت کانفرنس، کانگریس کی سرگرمیوں اور علی برادران کی جدوجہد جیسے پہلو نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

یہ وہ دور ہے جس میں اقبال کی خاموشی کو بعد ازاں بہت سے معنی پہنائے گئے اور طرح طرح کی توجیہات پیش کی گئیں مگر جاوید اقبال نے عصری صورتِ حال اور اقبال کے رویے کو بڑے منطقی انداز میں واضح کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کے تجزیاتی وجدان کی رہنمائی کو ایسے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے کہ اقبال کا اصل قد کاٹھ اور سمجھ بوجھ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

جاوید اقبال کے مطابق علامہ کی خانہ نشینی کا زمانہ ۱۹۱۴ء سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا

شوکت علی نے علی گڑھ کالج کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے علامہ اقبال کو دعوت بھیجی۔تو علامہ نے جواب میں لکھا ہے:

'' بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتیِ نوحؑ سمجھتا ہے۔ دُنیا اور اہلِ دُنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے، مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو، میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہوسکتی''۔ (۲۴)

جاوید اقبال نے سانحہ جلیانوالہ باغ کے بارے میں لکھا ہے:

'' ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا، جس میں ہندو، مسلم اور سکھ عوام نے شرکت کی۔ اس جلسہ میں موجود لوگوں کو گھیرے میں لے کر جنرل ڈائر نے بڑی بے دردی سے اندھا دھند گولیاں چلوائیں اور سینکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔اس سانحہ کے متعلق سر جان سمتھ اپنے سوانح حیات میں تحریر کرتا ہے کہ ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کی صبح کو جنرل ڈائر فوج کے ایک دستہ کے ساتھ امرتسر شہر کی گشت پر نکلا اور ڈھول کی چوٹ پر اعلان کروایا کہ جلسہ کرنا یا جلوس نکالنا غیر قانونی فعل ہے۔ اس لیے اگر کوئی جلسہ منعقد ہوا یا کوئی جلوس نکلا تو اس پر گولیاں برسائی جائیں گی۔ جب وہ سول لائنز میں واپس پہنچا تو اطلاع ملی کہ اس کے اعلان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بعد از دوپہر جلیانوالہ باغ نامی دیواروں سے محدود چوک میں ایک جلسہ ہونے والا ہے۔ پس اس نے فیصلہ کیا کہ اس چیلنج کا مقابلہ کرے گا۔اس نے ایک چھوٹا سا فوجی دستہ جو خالصتاً ہندوستانی نوجوانوں پر مشتمل تھا، جلیانوالہ باغ کے لیے منتخب کیا۔اس دستہ میں پچیس جوان گورکھا رجمنٹ کے، پچیس جوان فرنٹیر فورس رائفلز کے اور چالیس گورکھے تھے جو صرف کُکریوں سے لیس تھے۔ ان کے علاوہ دو آرمرڈ کاریں تھیں۔اس دستہ کی کمانڈ اس کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ گو کیپٹن برگز بھی اس کے ہمراہ تھا۔ جب وہ موقع پر پہنچا تو دس سے بیس ہزار تک کی تعداد میں لوگ موجود تھے اور انقلابی رہنما بڑی جوشیلی تقریریں کر رہے تھے۔ آرمرڈ کاریں آگے نہ بڑھ سکتی تھیں۔اس لیے جنرل ڈائر اپنے ساتھ پچاس عسکری لے کر مجمع میں داخل ہو گیا۔عسکریوں کو دیکھ کر ہجوم بپھرنے لگا۔جس پر جنرل ڈائر نے بغیر کسی تنبیہ کے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔عسکریوں نے تعمیل حکم میں ایک ہزار چھ سو پچاس راؤنڈ چلائے۔ گویا فی عسکری اوسطاً پینتیس راؤنڈ چلے۔ ہجوم میں افراتفری پھیل گئی۔کئیوں نے دیواریں پھاند کر بھاگ جانا چاہا، لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دیواروں سے

گھرے ہوئے اس رقبہ میں رائفلیں چلنے کی گونج کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی اور ہجوم کی چیخ و پکار میں سیز فائر کا کوئی حکم نہ سنا جا سکتا تھا۔ اس سانحہ میں جو لوگ مرے یا زخمی ہوئے، ان کی تعداد کا صحیح اندازہ آج تک نہیں لگایا گیا۔ قیاس ہے کہ مرنے والوں کی تعداد تین سو اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تیرہ سو کے لگ بھگ تھی۔ پھر ان کو وہاں سے اٹھوانے کا بھی کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ اقبال نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے:

ہر زائرِ چمن سے کہتی ہے خاکِ پاک
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے

سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

''جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے فوری بعد مائیکل اڈوائر کے حکم سے پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اس مارشل لا کے دوران طالب علموں اور عوام سے جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا۔ اس کی تفصیل عاشق حسین بٹالوی کی تصنیف میں ملتی ہے''۔ (۲۵)

اس باب میں خلافت کانفرنس کے قیام، مولانا محمد علی اور اقبال کے درمیان دل چسپ مکالمے کا احوال بھی بیان ہوا ہے:

''اسی سال کے اواخر میں مولانا محمد علی چار سال کی نظر بندی کاٹ کر ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے جلسہ میں شریک ہونے کے لیے لکھنؤ پہنچے اور اسی احتجاجی جلسہ میں خلافت کانفرنس قائم کی گئی۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں جلسہ ہوا، جس میں گاندھی اور چند ہندو رہنما بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں خلافت کانفرنس نے طے کیا کہ مسلمانانِ ہند، ترکیہ کی تقسیم، عثمانی سلطان خلیفہ کے اختیارات میں تخفیف اور مسلم مقامات مقدسہ پر غیر مسلموں کے قبضہ کے خلاف مظاہرے کریں۔ انگریزی حکومت سے عدم تعاون کا رویہ اختیار کریں اور انگریزی مال کا مقاطعہ کریں۔ بعد میں مولانا محمد علی بحیثیتِ قائدِ تحریکِ خلافت لاہور پہنچے اور اقبال سے ملنے کے لیے انارکلی والے مکان میں گئے۔ اقبال بیٹھک میں دھسہ اوڑھے بیٹھے حقہ کے کش لگا رہے تھے۔ مولانا محمد علی سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے انھیں دیکھتے ہی طنزاً کہا: ظالم! ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن تو ویسے کا ویسا دھسہ اوڑھے حقہ کے کش لگاتا رہتا ہے۔ گویا کچھ ہوا

ہی نہیں۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا۔ مولانا میں تو قوم کا قوال ہوں، اگر قوال خود ہی وجد و حال میں شریک ہو کر ہو حق میں تہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے۔ بہر حال اقبال نے خلافت کانفرنس کے ایک آدھ جلسہ میں شرکت کی اور صوبائی خلافت کمیٹی کے رکن بھی بن گئے''۔ (۲۶)

آگے چل کر دسمبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس کے جلسوں کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ ایک مقام پر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اقبال اور مرزا جلال الدین خلافت کانفرنس کے جلسہ کی رونق دیکھنے کے لیے نواب سر ذوالفقار علی خان کی موٹر کار میں امرتسر پہنچے۔ جب پنڈال میں داخل ہو کر اقبال، علی برادران سے بغلگیر ہوئے تو جلسہ میں عوام کے جوش وخروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ رو رہے تھے۔ اس موقع پر دونوں بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال نے دو اشعار جلسہ میں پڑھ کر سنائے جو بانگِ درا میں 'اسیری' کے عنوان کے تحت موجود ہیں اور جو اسی روز موٹر کار میں سفر کے دوران موزوں ہوئے تھے''۔ (۲۷)

دسمبر ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کے ترکی کے ساتھ ظالمانہ سلوک کے خلاف احتجاجی جلسے میں جو قرارداد علامہ اقبال نے پیش کی، ملاحظہ فرمائیے:

''جس قوم نے دُنیا میں آزادی اور حریت کی اشاعت کی تھی، آج اس کی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ جب بنی نوع انسان کو پامال کیا جاتا تھا۔ اس وقت اس قوم نے مساوات کا پرچار کیا۔ مسلمانو! تم کو یاد ہے، جب عرب میں نبیِ آخرالزماں ﷺ پیدا ہوئے۔ اس وقت دُنیا کی کیا کیفیت تھی۔ قسطنطنیہ میں قیصر کی سخت یورپ کی قوموں کا گلا گھونٹ رہی تھی، اس وقت یہ امر واضح کیا گیا کہ خدا کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت نہ کی جائے۔ تمھارا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو آزادی ملنی چاہیے.....خوشامد، منت یا مانگے سے کبھی کچھ نہیں ملا۔ خدا کے سوا کسی کی اطاعت ہمارے لیے واجب نہیں۔ یاد رکھو کہ جو قوم ایک بڑا مقصد لے کر پیدا ہوئی ہے، وہ یونہی نہیں مٹ سکتی۔ بادشاہیاں مٹ رہی ہیں۔ انسان نے اپنے فطری حقوق کا دعویٰ پیش کیا ہے۔ تمھاری تاریخ قربانیوں سے بھری پڑی ہے..... پریذیڈنٹ ولسن نے چودہ اُصول قائم کیے جن کے مطابق عالمگیر جنگ کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ ہر ایک قوم اپنے معاملہ کو خود فیصل کر لیا کرے۔ ہماری سرکار نے بارہا اس بات کا اعلان کیا کہ ہم حق، انصاف

اور صداقت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہماری جنگ اس لیے ہے کہ بین الاقوامی معاہدے قائم رکھے جائیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے حقوق کا خیال رکھا جائے اور اُن کو پامال نہ کیا جائے''۔(۲۸)

جاوید اقبال نے بہت مستند حوالوں کے ساتھ اقبال کی خلافت کانفرنس سے علیحدگی، خلافت کی برطانیہ روانگی کی مخالفت، ہجرت افغانستان کے خلاف موقف، مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدم تعاون کی تحریک چلانے پر پریشانی، شیخ اعجاز کی تحریک خلافت میں سرگرم شمولیت کی مزاحمت کی جو توجیہات پیش کی ہیں، وہ یقیناً قابلِ توجہ ہیں۔

جاوید اقبال نے اقبال کی گوشہ نشینی کی توجیہ بے حد منطقی پیرائے میں یوں کی ہے:

''اقبال کے بیشتر سوانح نگار یہی سمجھتے ہیں کہ اقبال نے اس عہد کی پرشور سیاست کے سبب کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور اس کے ہنگاموں سے الگ تھلگ پیامِ مشرق کی ترتیب میں مصروف رہے، لیکن یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے نقطۂ نگاہ کو نہ تو کوئی سمجھتا تھا اور نہ کوئی قبول کرنے کو تیار تھا۔ عدم تعاون کے حامی علما اور مسلم سیاسی رہنما سب ان کے خلاف ہو چکے تھے۔ اسی طرح تعاون پسند مسلم قائدین بھی انھیں شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اقبال کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ اسی دور میں ان کی کردار کشی کی مہم کا آغاز ہوا۔ پس اقبال کی لاتعلقی یا خانہ نشینی کا اصل سبب عالم تنہائی تھا اور وہ کسی ایسے ہم دم یا رفیق کے لیے ترستے تھے جو ان کا ہم خیال ہو۔ اس نوع کی تنہائی کا احساس انھیں چند برسوں سے لگاتار ہو رہا تھا''۔(۲۹)

آگے چل کر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''البتہ انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶/اپریل ۱۹۲۲ء میں انھوں نے اپنی مشہور نظم 'خضرِ راہ' کوئی بیس ہزار کے مجمع کے سامنے پڑھی۔ اقبال کو ان دنوں نہ صرف تنہائی کا شدید احساس تھا بل کہ بیمار بھی تھے، اس لیے نظم کے انداز بیان نے سامعین کو رلا دیا۔ نظم پڑھتے ہوئے اقبال نے یہ شعر پڑھا، تو رو پڑے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰؐ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا مجمع بھی اشک بار تھا:

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز''(۳۰)

''بات یہ ہے کہ اقبال کی نگاہ میں انقلابِ روس، یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں کی عیاری، جنگ زرگری، استحصال اور استعمار کا لازمی ردِعمل تھا۔ اور اس میں دُنیا بھر کے پس ماندہ انسانوں کے لیے جو پیغام مخفی تھا، اس نے اقبال کے ذہن میں ایک اہم سوال اٹھایا تھا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ یا اسلام نے مساوات کا جو تصور دیا ہے، اسے مادی اعتبار سے عملی طور پر ایک جدید مسلم معاشرے میں کیوں کر نافذ کیا جا سکتا ہے؟ اقبال کو یقین تھا کہ اگر اس سوال کا جواب نہ ڈھونڈا گیا اور مسلم اقوام مغرب کی اندھا دھند تقلید میں مصروف رہیں۔ تو ایک نہ ایک دن وہ سب بھی اسی قسم کے انقلاب کی لپیٹ میں آ جائیں گی اور اسلام کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا''۔ (۳۱)

اس باب میں برصغیر کے اردگرد کی سیاست اور اکھاڑ پچھاڑ پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایران، افغانستان اور ترکی کے معاملات پر بڑی جامع بحث پڑھنے کو ملتی ہے۔

اسی زمانے میں مسلم قومیت کے موضوع پر علامہ اقبال کے زوردار مؤقف کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اقبال مسلم اقوام میں مغربی طرز کے نیشنلزم کے فروغ پر خوش نہ تھے۔ پھر بھی انھیں یقین تھا کہ مستقبل میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جب مسلم اقوام کو اتحاد کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا''۔ (۳۲)

جاوید اقبال نے علامہ اقبال کا ایک خط بہ نام کریم بی بی محررہ ۸/دسمبر ۱۹۱۹ء کا ایک اقتباس نقل کیا ہے جس سے علامہ کی قوم کے لیے دردمندی، اُمّہ کی نشاۃِ ثانیہ کی خواہش اور حضور رسالت مآبؐ سے عشق ومحبت کا والہانہ اظہار ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا اور جس قوم نے آج تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے، اس کو ذلیل ورسوا نہ کرے گا۔ مسلمانوں کی بہترین تلوار دُعا ہے، سو اسی سے کام لینا چاہیے۔ ہر وقت دُعا کرنا چاہیے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا چاہیے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس امت کی دُعا سن لے اور اس کی غریبی پر رحم فرمائے۔ میں جو اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قوا

دینی علوم پڑھنے میں صرف ہوتے۔ تو آج خدا کے رسول ﷺ کی کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والد مکرم مجھے دینی علوم ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی، تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہرحال جو کچھ خدا کے علم میں تھا ہوا' اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام ومکمل نبیِ کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی''۔ (۳۳)

اپنے والد کو ایک خط محررہ ۳؍جون ۱۹۲۰ء میں ان کی مسلم امہ سے امیدوں کی ایک جھلک اور ملاحظہ فرمایئے:

''یہ زمانہ انتہائی تاریکی کا ہے، لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوعِ انسان کو پھر ایک دفعہ 'نور محمدیؐ' عطا کرے، بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دُنیا کی نجات نظر نہیں آتی''۔ (۳۴)

اب آیئے کچھ خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

صفحہ ۲۴۳ کی سطر ۱۱ اور ۱۳ پر 'مع' کو 'بمعہ' لکھا گیا، جو کوئی لفظ نہیں، دوسرا یہ کہ اس کا صحیح املا 'مع' ہے 'معہ' یا بمعہ نہیں۔

صفحہ ۲۴۴ پر لکھا ہے:

''سیکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا''

موت کی نیند سلانا کیا ہوا، اُردو میں محاورہ موت کے گھاٹ اتارنا مستعمل ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صفحہ ۲۴۵ پر یوں لکھتے ہیں:

''اس لیے جنرل ڈائر اپنے ساتھ پچاس عسکری لے کر مجمع میں داخل ہو گیا۔ عسکریوں کو دیکھ کر ہجوم بپھرنے لگا جس پر جنرل ڈائر نے بغیر کسی تنبیہ کے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ عسکریوں نے تعمیل حکم میں ایک ہزار چھ سو پچاس راؤنڈ چلائے، گویا فی عسکری اوسطاً پینتیس راؤنڈ چلے''۔

عسکری اور عسکریوں کا لفظ فوجی کے معنوں میں درست نہیں، اس کے معنی لشکر کے ہیں۔

صفحہ ۲۴۸ پر قائداعلیٰ کا املا اعلےٰ، کیا گیا۔ حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ صفحہ ۲۴۳ پر وہ استعفیٰ کا املا 'استعفا' کر چکے ہیں۔ اگر وہ استعفیٰ کو استعفا لکھتے ہیں تو انھیں جدید املا کے اُصولوں کے

مطابق اعلیٰ، کو اعلا لکھنا چاہیے تھا، تا کہ کتاب کے املا میں یکسانیت پیدا ہو سکے۔

صفحہ ۲۴۹ کی ایک سطر ملاحظہ ہو:-

''افسوس اس بات کا ہے کہ خلافت وفد نے اس معاملہ میں ترکوں اور عربوں کے نقطہ ہائے نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی''۔

نقطہ ہائے نظر ہوتا ہے، نقطہ ہائے نگاہ نہیں، یہ points of view کا ترجمہ ہے، اور view کا مطلب نظر ہے، نگاہ نہیں۔

صفحہ ۲۵۱ پر مرقومہ ایک ترکیب 'مکتبہ ہائے فکر' Schools of thought کا ترجمہ ہے، فارسی ترکیب نہایت نامانوس اور غریب ہے، حالاں کہ یہ ترکیب اُردو میں مکاتب فکر کی صورت میں مستعمل ہے۔

صفحہ ۲۵۶ پر علیٰحدہ کا املا علحدہ کیا گیا ہے، اس لفظ کا یہ کوئی املا نہیں۔ اگر انھیں اس صورت میں لکھنا مقصود تھا، تو پھر علاحدہ کر دیتے، تا کہ جدید املا میں آ جاتا، بہ صورت مذکورہ یہ املا غلط ہے۔

صفحہ ۲۵۷ پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے بتایا ہے کہ:

''جون ۱۹۲۱ء میں اقبال زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مقدمہ کے سلسلے میں کشمیر گئے''۔

مگر حوالہ نہیں دیا۔

اس باب میں اُسلوبِ اظہار کی بے ربطی بہ طور خاص محلِ نظر ہے۔ واقعات کی ترتیب و تہذیب درست نہیں۔ برصغیر کے سیاسی اور سماجی احوال و آثار کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان کے ساتھ علامہ کے سوانحی اور فکری اظہاریوں کو باہم مربوط نہیں کیا گیا۔ سیاسی احوال اور علامہ کے حالات و افکار علیحدہ علیحدہ اور بے ربط سے ہو کر رہ گئے ہیں۔

دوسرا یہ کہ 'مسجد شب بھر' کا تذکرہ کرتے ہوئے کبوتروں کا ذکر آ گیا، جو نہایت نامناسب ہے۔ اسی طرح علامہ کے کھانے پینے کے ضمن میں پسند و ناپسند کا تذکرہ بھی یہاں کچھ جچتا نہیں۔ اس بے ربطی کو ختم کرنے کی ضرورت تھی، لیکن فاضل سوانح نگار نے اس جانب توجہ نہیں دی۔

۷) ساتویں باب کا عنوان ''ہندو مسلم تصادم کا ماحول'' ہے۔ بارہ صفحات پر مشتمل یہ باب جلد دوم کا آخری جب کہ مسلسل چودھواں باب ہے۔ اس باب میں ہندو مسلم تصادم

کے اہم محرکات پر محض روشنی ہی نہیں ڈالی گئی' بل کہ صرف سرشادی لعل کے علامہ سے اختلافات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کس نوعیت کے تنازعات موجود تھے' ان کی مفصل حد بندی کی ضرورت تھی' لیکن اس باب میں ان امور کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ سرشادی لعل کے مسلمانوں کے ساتھ جو اختلافات تھے، صرف ان کا تذکرہ کیا گیا ہے' اس کے علاوہ بعض ایسے امور سامنے لائے گئے ہیں جن کا باب کے عنوان سے دور کا علاقہ نہیں بنتا۔ مثلاً

(۱) علامہ کو 'سر' کا خطاب ملنے کا واقعہ اور اس سلسلے میں ہونے والے اختلافات
(۲) پیامِ مشرق کی اشاعت اور اس کتاب کے مندرجات
(۳) بانگِ درا کی طباعت واشاعت
(۴) علامہ کی بیوی مختار بیگم کی بیماری اور وفات
(۵) علامہ کی تکفیر وغیرہ۔

مندرجہ بالا واقعات کا ہندو مسلم تصادم سے کسی بھی نوع کا کوئی تعلق نہیں، مگر یہ اس باب میں زیر بحث آئے ہیں۔ اس ایک باب پر ہی موقوف نہیں، بل کہ اس نوعیت کی بے اعتدالیاں ہر باب میں موجود ہیں' پھر احوال کی زمانی ترتیب بھی صحیح نہیں ہے۔ املا اور زبان کی غلطیاں اس باب میں بھی موجود ہیں۔ دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ''انھیں لنڈن ٹائمز کے ایک مقالہ نگار' جس نے اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا تھا، سے ملوایا گیا۔''(۳۵)

اس جملے میں 'انگریزی میں ترجمہ' کہنا غلط ہے' انگریزی ترجمہ ہی کافی ہے۔

(۲) ''۱۷ر جنوری ۱۹۲۳ء کو خطاب ملنے پر اقبال کے لیے ایک مبارک باد پارٹی کا اہتمام ہندو' مسلم اور سکھ معززین لاہور کی طرف سے مقبرہ جہانگیر میں کیا گیا۔''(۳۶)

علامہ کو خطاب ۱۷ر جنوری کو نہیں' یکم رجنوری کو ملا۔ شاید جاوید اقبال یہاں یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ۱۷ر جنوری کو ان کے اعزاز میں تقریب ہوئی، مگر مذکورہ بالا جملے سے اس کا پتا نہیں چلتا۔

(۳) ''اسلام ہندوستان میں آٹھویں صدی عیسوی میں وارد ہوا''۔(۳۷)

محمد بن قاسم کی آمد (۷۱۲ء) سے قبل بھی اسلام اور مسلمان ہندوستان میں وارد ہو چکے

تھے۔(دیکھیے تاریخ ادب اُردو، جلد اوّل)(۳۸)

(۴) ''بندہ اپنی جان بھی حضورؐ پر سے قربان کرسکتا ہے''۔(۳۹)

بندہ واقعتاً جان قربان کرنے والا ہو' تو ''پر اور سے'' کی اکٹھی ضرورت نہیں رہتی' اسے اکیلا ہی کافی ہوسکتا ہے۔

(۵) ''۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ہندو مسلم اختلافات بڑھتے چلے گئے''۔(۴۰)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ہنگامہ کہنا.....ایں چہ بوالعجبیست

(۶) زمیندار میں یہ خط، اقبال کی پہلی تحریر ہے' جس کے مطالعہ سے ان کے معاشی تصورات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے''۔(۴۱)

یہ خط ۱۹۲۳ء کا مطبوعہ ہے' جب کہ اس خط کی اشاعت سے بیس سال قبل ۱۹۰۳ء میں علامہ علم الاقتصاد کے عنوان سے جو کتاب لکھ چکے تھے' اس سے ان کے معاشی تصورات کو سمجھنے میں مدد نہیں مل سکتی۔ اگر ایسا ممکن ہے اور یقیناً ہے تو پھر ایک پوری کتاب کے مقابلے میں خط کی اہمیت: ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

(۷) ''محمد عبدالرزاق نے ان کی اجازت کے بغیر مختلف رسالوں اور اخباروں میں سے ان کا کلام اکٹھا کر کے کلیاتِ اقبال کے نام سے حیدرآباد دکن میں شائع کر دیا''۔(۴۲)

حیدرآباد دکن 'میں' کے بجائے 'سے' ہونا چاہیے۔

(۸) ''علما جو عرصہ دراز سے ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے''۔(۴۳)

''خار کھانا کی جگہ ادھار کھانا'' کا محل تھا' مگر۔

(۹) انشاءاللہ کو ان شاءاللہ لکھنا چاہیے(۴۴)

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱- پیش لفظ زندہ رُود: جلد دوم' جاوید اقبال: لاہور' شیخ غلام علی اینڈ سنز' بار سوم: ۱۹۸۵ء' ص: الف

۲- زندہ رُود جلد دوم' ص: ۱۴۶

۳- ایضاً،ص۱۳۹
۴- اقبال: ایک تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر ملک حسن اختر، لاہور، یونیورسل بکس، ص: ۷۲-۷۳
۵- زندہ رُود جلد دوم: ص۱۳۹
۶- اقبال: ایک تحقیقی مطالعہ، ملک حسن اختر، ص: ۷۳-۷۴
۷- زندہ رُود جلد دوم: ص۱۴۷
۸- ایضاً،ص۱۴۶
۹- ایضاً،ص۱۴۸-۱۴۹
۱۰- ایضاً،ص۱۵۱
۱۱- ایضاً،ص۱۷۹
۱۲- ایضاً،ص۱۸۱
۱۳- ایضاً،ص۱۸۱
۱۴- ایضاً،ص۱۶۲
۱۵- ایضاً،ص۱۶۷
۱۶- ایضاً،ص۱۶۷
۱۷- ایضاً،ص۱۶۷
۱۸- ایضاً،ص۱۶۶
۱۹- ایضاً،ص۱۶۷
۲۰- ایضاً،ص۱۷۰
۲۱- ایضاً،ص۲۰۷-۲۰۸
۲۲- ایضاً،ص۲۱۹
۲۳- ایضاً،ص۲۲۱
۲۴- ایضاً،ص۲۴۴
۲۵- ایضاً،ص۲۴۴-۲۴۵
۲۶- ایضاً،ص۲۴۶-۲۴۷
۲۷- ایضاً،ص۲۴۷
۲۸- ایضاً،ص۲۴۷-۲۴۸
۲۹- ایضاً،ص۲۵۸
۳۰- ایضاً،ص۲۵۹
۳۱- ایضاً،ص۲۶۱

۳۲- ایضاً،ص۲۶۳
۳۳- ایضاً،ص۲۶۵
۳۴- ایضاً،ص۲۶۶
۳۵- ایضاً،ص۲۶۸
۳۶- ایضاً،ص۲۶۸
۳۷- ایضاً،ص۲۷۱
۳۸- تاریخ ادب اُردو ، جلداول: ڈاکٹرجمیل جالبی،لاہور،مجلس ترقی ادب: باراوّل: ۱۹۷۵ء
۳۹- زندہ رُود جلد دوم:ص۲۷۲
۴۰- ایضاً،ص۲۷۲
۴۱- ایضاً،ص۲۸۰
۴۲- ایضاً،ص۲۸۰
۴۳- ایضاً،ص۲۸۹
۴۴- ایضاً،ص۲۶۹

☆☆☆☆☆

زندہ رُود

جلد سوم کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

زندہ رُود کی تیسری اور آخری جلد، حیاتِ اقبال کے اختتامی دور کا احاطہ کرتی ہے۔ اس جلد میں جنوری ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کے حالات و واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں علامہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ عملی طور پر یہ ان کی سیاست میں پہلی اور آخری شرکت تھی۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے سیاست دان اور قانون فہم مفکر تھے، مگر سیاست میں ان کا عمل دخل کچھ زیادہ نہیں رہا۔ ذہنی اور نظریاتی طور پر وہ جتنے سرگرم تھے، عملی اعتبار سے وہ اتنے ہی سیاست سے دور رہے۔ تیرہ سال کے دورانیے میں بہ قول جاوید اقبال:

''اس دور میں اقبال کی شخصیت کے کئی نئے پہلو ظاہر ہوئے۔ وہ احیائے اسلام اور مسلمانانِ برصغیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کی سمت کی تعین کے بارے میں اپنے دینی، سیاسی، اخلاقی، قانونی، تمدنی، معاشی اور الٰہیاتی خیالات کو مخالفین کی پرواہ کیے بغیر ترتیب دیتے چلے گئے، مگر بالآخر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر عجب بے چینی، بے تابی اور بے قراری کے عالم میں وفات پائی۔''(۱)

سابق دونوں جلدوں کی طرح یہ جلد بھی سات ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ جلد حسبِ ذیل عنوانات کے تحت حیاتِ اقبال کے احوال و آثار سے بحث کرتی ہے۔

۱- عملی سیاست کا خارزار
۲- دورۂ جنوبی ہند
۳- مسلم ریاست کا تصور
۴- گول میز کانفرنس
۵- افغانستان
۶- علالت

۷- آخری ایام

اس جلد کے کل صفحات ۴۱۸ (۲۹۱ تا ۶۷۶) ہیں۔

۱) تیسری جلد کا پہلا باب، جس کا مسلسل نمبر پندرہ ہے ''عملی سیاست کا خار زار'' کے عنوان تلے اکاون صفحات کو محیط ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ کی سیاست میں عملاً شرکت کا تفصیلی جائزہ مرتب کیا ہے، گو علامہ فکری اور نظریاتی سطح پر تو سیاسیات سے گہری وابستگی رکھتے تھے، لیکن ۱۹۲۶ء سے ماقبل وہ عملی طور پر سیاست کے میدان میں نہیں اترے تھے۔ ابتدا میں وہ ہندو مسلم اتحاد کے پرجوش حامی اور مبلغ تھے، لیکن جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ مسلمان اور ہندو آزادی کے حصول میں باہم متحد ہو کر نہیں چل سکتے، بہرحال احساس ہوتے ہی وہ جداگانہ تصور کے حامی ہو گئے اور انھوں نے وطنیت کے بجائے قومیت کا اُصولی اور اسلامی تصور پیش کیا۔ وہ مسلمانوں کی عملی سیاست کو بے کار مشق، وقتی اور ہنگامی چیز گردانتے تھے اور اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عملی سیاست میں شمولیت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ تھا:

'' ہوس بھی ہو تو نہیں مجھ میں ہمت تگ و تاز
حصول جاہ ہے وابستۂ مذاق تلاش

ہزار شکر، طبیعت ہے ریزہ کار مری
ہزار شکر نہیں ہے دماغ فتنہ تراش

مرے سخن سے دلوں کی ہیں کھیتیاں سرسبز
جہاں میں ہوں میں مثال سحاب دریا پاش

یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں
کہ فیض عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

۱۹۲۶ء میں جب اقبال کونسل کے الیکشن میں کھڑے ہوئے، تو انھیں اپنے مدمقابل ملک محمد دین کی طرف سے مختلف نوعیت کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً:

۱-انھیں وہابی العقیدہ کہا گیا۔
۲-صوفیا کا مخالف قرار دیا گیا۔
۳-ابن سعود کا حامی بتایا گیا۔

ایک اشتہار پر ان سے چودہ سوالات کیے گئے' یہ اشتہار لاہور شہر کی دیواروں پر چسپاں کیا گیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''اس قسم کے چودہ سوالات اشتہار کی شکل میں دیواروں پر چسپاں کیے گئے اور اُن کا اُسلوب الزام تراشی یا بہتان طرازی کے سوا کچھ نہ تھا۔''(۲)

لیکن علامہ نے ان اشتہارات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل علامہ کے حامیوں سے لاہور شہر بھرا پڑا تھا۔ لاہور کی معروف شخصیتوں نے ان کا ساتھ دیا۔ محمد حنیف شاہد نے اپنی کتاب اقبال اور پنجاب کونسل (۳) میں ان تمام نام ور لوگوں کے نام دیے ہیں' جو علامہ کے حامیوں میں شامل تھے۔ ۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو الیکشن ہوا اور علامہ بھاری اکثریت سے کامیاب قرار پائے۔ وہ ۱۹۳۰ء تک پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ ان تین برسوں میں انھوں نے مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام کیا۔ بہ قول ڈاکٹر جاوید اقبال:

''جنوری ۱۹۲۷ء میں اقبال پنجاب کونسل کی فنانس کمیٹی اور ایجوکیشن کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے۔ ۱۳ فروری ۱۹۲۷ء کو انھوں نے کونسل کے آئندہ اجلاس میں دو قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ اوّل یہ کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں بیکاری اور بے روزگاری کے پیشِ نظر حکومت بیکار تعلیم یافتہ اشخاص کو قطعات اراضی عطا کرے تا کہ وہ اس میں زراعت کر سکیں۔ دوم یہ کہ چوں کہ حکومت ہند نے پنجاب کا سالانہ زرتعاون معاف کر دیا ہے' اس لیے ٹیکسوں میں تخفیف کرنے کے لیے ایک مجلس تحقیقات مقرر کر دی جائے' تا کہ تخفیف سب محصول گزاروں پر مساوی طور پر تقسیم ہو سکے۔''(۴)

پنجاب کونسل کے ممبر کی حیثیت سے علامہ کا یہ تین سالہ (۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۰ء) دورانیہ عملی سیاست میں صرف ہوا۔ علامہ اس زمانے میں بہ قول ڈاکٹر جاوید اقبال:

''۱۹۳۰ میں پنجاب کونسل کی مدت رکنیت کے خاتمہ کے بعد اقبال برصغیر کے مسلمانوں میں ایک اہم سیاسی شخصیت کے طور پر ابھرے، انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے منتخب صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد میں اپنا معروف خطبہ دیا، .....دراصل مسلمانان برصغیر کے لیے اقبال کی

خدمات کے دو قابلِ ذکر پہلو اس عہد میں منکشف ہوئے۔ ایک خالصتاً عملی، جس کا تعلق سیاسیات سے تھا اور دوسرا خالصتاً فکری، جس کا اظہار وہ شروع ہی سے اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں میں کرتے چلے آ رہے تھے، مگر اس دور میں انھوں نے الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو کے سلسلہ میں اپنے مقالات کے ذریعہ کیا۔''(۵)

یہ باب علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کے عملی رویوں کا نقیب ہے۔ فاضل مصنف نے عملی سیاست کے مختلف النوع زاویوں کو نمایاں کیا ہے۔ علامہ نے یہ زمانہ نہایت سرگرمی سے گزارا، مگر ہمیشہ کے لیے اس سے وابستہ ہو کر نہیں رہے، وہ پنجاب کونسل کی ممبری کے بجائے کسی بڑے سے بڑے عہدے کے لیے موزوں تھے، لیکن سیاست اور سیاسی زندگی کو منتہائے مقصود نہ بنانے کی وجہ سے وہ آئندہ زندگی میں سیاست سے دور ہی رہے۔ سیاست سے ان کی نظریاتی اور فکری دل چسپی اور وابستگی یورپ روانگی سے قبل ہی ہو گئی تھی۔ البتہ یورپ کے زمانہ قیام کے دوران میں، انھوں نے اپنے گہرے مطالعے کی وجہ سے اپنے سیاسی نظریات کو اسلامی رویوں کے تابع کر لیا تھا اور یوں وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے سیاسی فتنے، نظریۂ وطنیت کے خلاف تصورِ قومیت کے قائل ہو گئے تھے۔ ان کے اس نظریے کا اظہار بانگِ درا کی نظموں میں بھی دکھائی دیتا ہے، اور بعد میں شائع ہونے والی کتابیں بھی تصورِ قومیت کے فکری رویوں اور اُن کے بنیادی خدوخال اور اس کی تعبیر سے خالی نہیں۔ آخری معرکہ مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ رہا۔ جنھوں نے قوم کی بنیاد وطن کو قرار دیا تھا، لیکن علامہ نے فرمایا:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمدؐ عربی است

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است(۶)

۲) تیسری جلد کا دوسرا باب کتاب کے تسلسل میں سولہواں باب ہے اور ۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ باب دورۂ جنوبی ہند سے متعلق ہے۔ علامہ کا یہ سفر جنوبی ہند' خالصتاً علمی نوعیت کا تھا، ڈاکٹر جاوید اقبال کے بہ قول:

''اس سفر کے دوران انھوں نے اپنے خطبات کے ذریعے اسلامی تمدن کی قدیم فکری روایات' فکر جدید کی روشنی میں پیش کر کے عہد حاضر کے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ مستقبل میں ایک نیا اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کی کوشش کریں۔''(۷)

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کا تصور حیات، عملی اور متحرک ہے۔ وہ ابتدا ہی سے جمود کے بہت خلاف تھے۔ ان کی شعری اور نثری تحریروں سے ان کے اس نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ اگر چہ اس عقیدے کی وجہ سے انھیں اختلاف کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر وہ اپنے عقیدے کی ترویج' اشاعت اور پرچار میں ثابت قدم رہے۔ مدراس کے سیٹھ جمال محمد کی دعوت پر علامہ نے چھ مقالات لکھنے کا وعدہ کیا، مگر جنوری ۱۹۲۹ء تک صرف تین مقالات ہی لکھے جا سکے اور یہی مقالات انھوں نے مدراس' بنگلور' میسور اور حیدر آباد دکن میں پڑھے۔ بقیہ تین خطبے بھی ۱۹۲۹ء میں تکمیل پذیر ہوئے اور علی گڑھ میں دیے گئے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے خطبات کے سلسلے میں موضوعات کا انتخاب کیا اور ساتھ ہی ضروری مواد اکٹھا کرنے کا آغاز بھی کیا۔ وہ معاصر علماء سے بھی مراسلت کرتے رہے۔ ان کے خطوط سے ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس سلسلے میں وہ تمام سوالات یک جا کر دیے ہیں جو خطبات کی ترتیب وتہذیب کے ضمن میں وہ علما سے کرتے رہے۔ ملاحظہ ہو' جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال کی کتاب کا وہ متعلقہ حصہ' جس میں تمام تر سوالات یک جا صورت میں ملتے ہیں:

''متکلمین میں سے بعض نے علم مناظر و مرایا کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالی کو دیکھ سکنا ممکن ہے۔ بحث کہاں ملے گی؟ رویت باری کے متعلق جو استفسار کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے آئن اسٹائن کے انقلاب انگیز نظریۂ نور پر کچھ روشنی پڑے۔ اس خیال کو ابن رشد کے ایک رسالہ سے تقویت ہوئی، جس میں انھوں نے ابوالمعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے اور ابوالمعالی کا خیال آئن اسٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے' گو مقدم الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے اور موخر الذکر

نے ریاضی کی رو سے ثابت کر دیا ہے۔''

کیا اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مثلاً مدت شیر خوارگی جو نصِ صریح کی رو سے دو سال ہے' کم یا زیادہ ہو سکتی ہے یا حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے؟ بعض حنفا اور معتزلیوں کے نزدیک اجماع امت یہ اختیار رکھتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے آپ نے ارشاد کیا ہے کہ فقہا نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز سمجھی ہے۔ ایسی تخصیص یا تعمیم کی کوئی مثال؟ کیا ایسی تخصیص تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علما و مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو آگاہ کیجیے۔ تخصیص یا تعمیم حکم سے کیا مراد ہے؟ اگر صحابہ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہو تو اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا۔ کیا کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو؟

حضور سرور کائناتؐ نے کسی دریافت کردہ مسئلہ کا جو جواب وحی کی بنا پر دیا وہ تمام امت پر حجت ہے اور وہ وحی بھی قرآن مجید میں داخل ہو گئی، لیکن جو جواب محض استدلال پر دیا گیا جس میں وحی کو داخل نہیں کیا' کیا وہ بھی تمام امت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضورؐ کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں؟

نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں: نبوت اور امامت' نبوت میں احکام قرآنی اور آیات قرآنی سے حضور ﷺ کے استنباط داخل ہیں۔ اجتہاد کی بنا محض عقل بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے۔ کیا یہ بھی وحی میں داخل ہیں؟ اگر وحی میں داخل ہے تو اس پر آپ کی دلیل کیا ہے؟

وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں۔

حضورؐ نے اذان کے متعلق صحابۂ کرام سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت آئے گا یا امامت کے تحت؟

آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدہ توریث میں جو اُصول مضمر ہے' صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟

آیۂ وصیت کی وضاحت کیجیے؟

کیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کو کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ملتوی کر دے اور اس کی

جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے؟ اس اختیار کی بنا کون سی آیت قرآنی ہے؟
امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے؟
ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دُنیا کے لیے ایک امام ہونا چاہیے؟ موخرالذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیسے بروئے کار آ سکتی ہے؟
حضرت عمرؓ نے طلاق کے متعلق جو طریقہ اختیار کیا، اگر اس کا اختیار انھیں شرعاً حاصل تھا تو اس اختیار کی اساس کیا تھی؟ زمانہء حال کی زبان میں آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان کو ایسا اختیار دیتی تھی؟ فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے' وہ بیوی کو یا اس کے کسی خویش یا کسی اور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کی بنا کوئی آیت قرآنی ہے یا حدیث؟
امام ابوحنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچہ کے ولدالحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اُصول محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا جزو قانون ہے؟
شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے۔ لاتسبو الدھر.....الخ' کیا حکمائے اسلام میں کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟
قرون وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن ہیمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بل کہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے۔ ہیمون نے قرطبہ میں مسلم یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی، اس لیے کیا اس کا یہ مذہب بھی کسی مسلم حکیم کی خوشہ چینی ہے؟
مولانا شبلی نے ایک فقرہ شعائر وارتفاقات کے متعلق نقل کیا ہے۔ وشعائر امر ظاہر تخصیص بہ و یمتاز صاحبہ بہ فی سائر الادیان کالختان وتعظیم المساجد والاذان والجمعہ والجماعات، کیا یہ شاہ ولی اللہ کی اپنی تشریح ہے؟ اسی طرح ارتفاقات میں شاہ ولی اللہ کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں' داخل ہیں۔ مثلاً: نکاح وطلاق کے احکام وغیرہ۔ اگر شاہ ولی اللہ کی یہ تشریح صحیح ہے تو سوسائٹی کا کوئی انتظام نہ رہے گا اور ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور ومراسم کی پابندی کریں گے؟ اس کی وضاحت کیجیے۔
الکلام (یعنی علم کلام جدید) میں مولانا شبلی نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۲۳ کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے، جس کے مفہوم کا خلاصہ انھوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے۔ اس کے آخری

حصہ کا ترجمہ یہ ہے: اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے اس فقرے میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے اور اس کے تحت کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں؟

کیا حجۃ اللّٰہ البالغہ میں کسی جگہ شعار کی تشریح شاہ ولی اللہ نے کی ہے؟

شاہ ولی اللہ نے لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا ہے۔ ان کا اصل مقصود کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں' ان چار قسموں میں تمدنی امور، مثلاً: نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آجاتے ہیں۔ کیا ان کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے؟

صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کا حوالہ دیجیے۔

متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر بحث کون سی کتاب میں ملے گی؟

ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون سے ہیں؟ مُلّا جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی ہندی مسلمانوں میں پیدا ہوئے؟ ان کے اسما سے مطلع فرمایئے اور تصانیف سے بھی۔

ہندی مسلم فلسفی ساکن پھلواروی مصنف تسویلات فلسفہ کا نام کیا ہے؟ کتاب مذکور کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوگا۔

مولوی نورالاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان جو رامپور میں ہے' کس زبان میں ہے؟ قلمی ہے یا مطبوعہ مولوی نورالاسلام کون سا ہے؟

مسئلہ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراض ہمارے متکلمین نے کیے وہ مسئلہ زمان کے متعلق خود ان کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ مولوی سیّد برکات احمد نے دہر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مسئلہ نہایت مشکل ہے، اس پر مزید روشنی ڈالیے۔

اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟

جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے۔ اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے۔ یعنی زمان اور مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال محی الدین ابن

عربی کے خیال سے صحیح ہے؟ کیا انھوں نے مکان پر بھی بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟

میں نے زمان و مکاں کے مسئلہ کے متعلق مطالعہ کیا ہے جس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستان کے مسلم فلسفیوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور وفکر کیا ہے اور اس غور وفکر کی تاریخ لکھی جاسکتی ہے، یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔

آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو عارضی طور پر منسوخ کردے، بل کہ بعض فرائض کو بھی یونہی منسوخ کرسکتا ہے۔ اس کا حوالہ کہاں ملے گا؟

کیا یہ صحیح ہے کہ متعہ (نکاح موقت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانوں میں مروج تھا اور حضرت عمرؓ نے اسے منسوخ کر دیا؟ کیا زمانہ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟ ان معاملات کی ایک فہرست دیجیے جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے۔ جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر قرآن شریف میں مقرر ہے ان کے متعلق امام کیوں کر رائے دے سکتا ہے۔ تواتر عمل کی ایک مثال آپ کے نزدیک نماز ہے۔ مالکیوں، حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلاف صورت نماز میں ہے وہ کیوں کر ہوا؟

احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اُصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کرسکتا ہے تو ان کے عمل کو محدود بھی کرسکتا ہے۔ اس کی کوئی مثال ہو تو واضح کیجیے۔

زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ قاضی مبارک کا شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے۔ وہ فتویٰ کیا ہے؟

اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرعِ اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی؟

لفظ نبی کے دو معنی ہیں: خبر دینے والا اور مقام بلند پر کھڑا ہونے والا: اوّل الذکر نبی ہمزہ کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزہ کے۔ اس ضمن میں راغب اصفہانی نے مفردات میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے، یعنی آنحضورؐ نے فرمایا کہ میں نبی غیر ہمزہ کے ہوں۔ قرآن شریف میں جن انبیاؑ کا ذکر ہے ان میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزہ کے ہیں؟ اگر قرآنی انبیاؑ یا آنحضورﷺ نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا مرجمہ انگریزی ترجمہ ''پرافٹ'' جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟

لفظ نار کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے؟
لفظ نجات کا روٹ کیا ہے اور روٹ کے رو سے کیا معنی ہیں؟''(۸)

ان سوالات سے کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس نوعیت کے مسائل علامہ کے پیشِ نظر رہے ہیں اور انھوں نے کس قدر غور وخوض اور تفکر وتدبر کے بعد پانچ سال کے دورانیے میں خطبات تحریر کیے۔ ۱۹۲۹ء کی ابتدائی تاریخوں میں علامہ نے تین خطبات جنوبی ہند کے سفر کے دوران ارشاد فرمائے۔ ۱۹۲۹ء کے آخر میں چھے خطبات علی گڑھ میں دیے۔ اس باب میں جاوید اقبال نے نہایت تفصیل کے ساتھ جنوبی ہند کے سفر کی تفصیلات فراہم کر دی ہیں بل کہ انھوں نے خطبات کی تحریر وترتیب سے لے کر ان کے پڑھنے تک کے تمام مراحل کا احاطہ بھی کیا ہے۔ اپنی جامعیت کے لحاظ سے یہ بات کتاب کے اہم ترین حصوں میں شامل ہے۔

۳) تیسرا باب بہ عنوان ''مسلم ریاست کا تصور'' زندہ رُود کا مسلسل ستر ہواں باب ہے جو ۴۴ صفحات کو محیط ہے۔ اس باب میں دوقومی نظریے کے مالہ وماعلیہ سے بحث کی گئی ہے۔ برصغیر کی سیاست میں ہندو اور مسلم تہذیبوں کے متصادم رویوں کے پس منظر میں مسلم ریاست کے تصور کو ابھارا گیا ہے۔ ہندو مسلم آویزش آٹھویں صدی عیسوی میں ہی شروع ہوگئی تھی، البتہ بعد میں مسلمانوں کے برسرِاقتدار آجانے کی وجہ سے ہندو کھل کر مخالفت تو نہ کرتے تھے' لیکن پس پردہ ان کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی شکست کے بعد' ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آ گئی۔ ان حالات میں کئی ایک مسلم زعما ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے' مگر علامہ نے اپنی دوررس نگاہوں سے دیکھ لیا کہ یہ دونوں قومیں باہم مل کر نہیں رہ سکتیں' سو ۱۹۳۰ء میں انھوں نے خطبۂ الٰہ آباد میں مسلم ریاست کی تشکیل کا تصور پیش کیا۔ جو سترہ سال بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں معرض وجود میں آیا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دوقومی نظریے پر بحث کرتے ہوئے ان دیگر مسلم رہنماؤں کے تصور کی وضاحت نہیں کی، جنھوں نے اقبال سے قبل مسلم اضلاع یا مسلم صوبوں کے قیام کا خیال ظاہر کیا تھا۔ حالاں کہ ضرورت اس امر کی تھی کہ یہاں یہ وضاحت کی جاتی کہ

تصور پاکستان کی تشکیل اور تہذیب کے سلسلے میں اقبال کے سوا کسی بھی دوسرے رہنما کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ آج کل یہ بحثیں بہت کثرت سے ہو رہی ہیں کہ تصور پاکستان اقبال نے نہیں دیا تھا' بل کہ یہ ان سے قبل پیش کیا جا چکا تھا۔ حالاں کہ تاریخ اور اس کے عوامل سے متعلق ارباب دانش جانتے ہیں کہ اقبال کے تصور مسلم ریاست کے اعلان سے قبل یہ نظریہ کسی بھی سیاسی اور مذہبی رہنما کے حیطۂ خیال سے بھی نہیں گزرا تھا۔ دستاویزات کی روشنی میں جاوید اقبال کو اس مسئلے پر گفتگو کرنا چاہیے تھی' مگر انھوں نے اس جانب توجہ نہیں دی۔

۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے خطبے میں مغربی ہند میں مسلم ریاست کا تصور پیش کیا گیا، لیکن اس تصور اور تجویز میں صوبہ بنگال کا ذکر نہیں تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خطبۂ الٰہ آباد میں شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کا تصور تو پیش کیا گیا، لیکن مسلم اکثریتی صوبہ بنگال کا ذکر موجود نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجوزہ مسلم ریاست کا تصور ایک نصب العین کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کے قیام کے سلسلے میں وہاں کی مسلم اکثریت کے بارے میں کم از کم کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ جس سے ظاہر ہے کہ بنگال بھی اقبال کے پیشِ نظر تو تھا مگر اس کا واضح ذکر اس لیے نہ کیا گیا کہ اگر شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریت کی بنا پر مسلم ریاست کے قیام کا اُصول قابلِ قبول ہوتا ہے تو منطقی طور پر اس اُصول کا اطلاق مشرقی ہند پر بھی کیا جا سکتا تھا' جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے' ان کا خطبے میں ذکر کرنا اس لیے غیر ضروری تھا کہ وہاں مسلمانوں کو ویٹج یا پاسنگ دینے پر ہندوؤں کو ایک اعتراض نہ تھا۔ بل کہ شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام کے نتیجے میں قوت کے توازن کے سبب ان کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہوتی تھی۔''(۹)

علامہ اقبال کے اس پیش کردہ موقف کی فوری طور پر تائید نہ کی گئی۔ البتہ برطانوی حکومت کے حامی دھڑے سخت برہم ہوئے اور ہندو پریس نے بہت ہنگامہ کیا۔ وہ خطبہ مذکورہ پر دوران تبصرہ گالم گلوچ اور الزام تراشی پر اتر آئے۔ پرتاب اخبار نے علامہ کو جنونی' شر انگیز' احمق' خوف ناک' زہریلا' تنگ نظر' پست نظر' متعصب' قابلِ نفرت' کمینہ اور نالائق جیسے القابات سے نوازا۔(۱۰)

انقلاب اخبار نے علامہ کی حمایت میں اداریے لکھے اور مضمون چھاپے۔ اوّل اوّل اس خطبے

کا اُردو ترجمہ بھی دو قسطوں میں 'انقلاب' میں ہی چھپا، لیکن ہندو اخبارات نے بہتان تراشی کی حد کر دی۔ انھوں نے علامہ پر انگریز دوستی کا الزام عائد کیا اور اس ضمن میں حسبِ ذیل دلائل دیے:

۱- انگریز حکام کی مدح میں فرمائش پر نظمیں لکھنا

۲- خلافت یا ترک موالات کی تحریکوں میں حصہ نہ لینا

۳- سر کا خطاب قبول کرنا

۴- پنجاب کونسل کی رکنیت کے ذریعے انگریز کے نظام حکومت سے تعاون کرنا

۵- کونسل کے اندر برطانوی استعمار کو مستحکم کرنے کی خاطر انگریز عہدہ داروں کی تعداد میں اضافہ کی خواہش کا اظہار کرنا

۶- سائمن کمیشن سے تعاون کرنا

۷- سر محمد شفیع جیسے برطانیہ کے حاشیہ بردار کا ساتھ دینا

۸- انگریز کے اشارے پر خطبۂ الٰہ آباد میں مسلم ریاست کا تصور پیش کرنا

۹- دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگریزی حکومت کا انھیں نامزد کرنا

۱۰- انگریز کے اشارے پر ہندو مسلم مفاہمت میں رخنہ انداز ہونا

جاوید اقبال نے ان الزامات کا بہ دلائل جواب دیا ہے اور ایک ایک الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے تاریخی دستاویزات اور لوازمات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کے دلائل کی صلابت اور پختگی حیرت انگیز ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ہر بات کا منفی پہلو نکالا جا سکتا ہے اور اس کا انحصار معترض کی اپنی ذہنیت پر ہے کہ وہ کس حد تک بیمار ہے' جو لوگ فکرِ اقبال سے بخوبی شناسا ہیں انھیں علم ہے کہ اقبال قنوطیت کے قائل نہ تھے بل کہ رجائیت پسند تھے اور اُن کے ہاں مستقبل یا تقدیر کی کوئی متعین صورت نہیں ہے۔ صرف امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے نہ آئیں۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبے ایک دوسرے کے ساتھ ملحق ہیں اور اُن کو خدائے حکیم وعلیم وخبیر نے بلا مصلحت نہیں بل کہ کسی مصلحت کے لیے یک جا رکھا ہے۔ سو انھوں نے مسلم ریاست کا تصور پیش کرنے سے قبل اپنی شعری تخلیقات اور نثری تحریروں کے ذریعہ نہ صرف مسلم قومیت کو اجاگر کرنے یا اسے فروغ دینے کی کوشش کی بل

کہ مسلم ریاست کے لیے ایک فکری یا نظریاتی اساس بھی ترتیب دی۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۷ء سے لے کر ان کی وفات تک جاری رہا۔ مدعا یہ تھا کہ اگر بالآخر مسلم ریاست وجود میں آتی ہے تو اس کے لیے فکری یا نظریاتی اساس پہلے ہی سے موجود ہو۔ گویا انھوں نے اس کے وجود میں آنے کے امکان کی بنا پر اس کے لیے تقریباً تیس برس کی مدت میں نظریاتی اساس فراہم کر دی تھی۔ تیس برس یا اقبال کی نصف عمر پر پھیلا ہوا یہ تخلیقی اور تعمیری عمل کیا ان کی قنوطیت' مایوسی یا ناامیدی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس بحث کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ اقبال کے معترضین بالخصوص پنجاب کے ہندو پریس نے ان پر ہمیشہ یہ الزام لگایا کہ اقبال ہی وہ خوفناک مسلمان ہے جو ہر مرحلہ پر ہندو مسلم مفاہمت میں رخنہ انداز ہوتا ہے۔ اگر اس الزام کو لحظہ بھر کے لیے درست تسلیم کر لیا جائے تو کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ یہی کہ وہ کسی صورت میں بھی ہندو مسلم مفاہمت کے خواہش مند نہ تھے۔ ان کا نصب العین مختلف تھا یا وہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کو مسلم ریاست کی طرف لے جانے کے لیے فکری اور عملی جدوجہد میں مصروف تھے۔ پس دونوں صورتوں میں اقبال کے نقطۂ نگاہ [نقطۂ نظر] سے مسلم ریاست کے تصور یا قیام میں مایوسی یا ناامیدی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

ہندوستان میں اور انگلستان کے بعض حلقوں میں اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد پر تبصرے جاری رہے۔ ۱۹۳۱ء کے چند ابتدائی مہینوں میں زور وشور زیادہ تھا' لیکن ۱۹۳۲ء تک بات آئی گئی ہوگئی۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے تقریباً دو سال بعد ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے قرار داد لاہور، جسے بعد میں قرار داد پاکستان کا نام دیا گیا' منظور کی اور اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد پھر موضوع بحث بن گیا۔ اسے کئی اداروں نے دوبارہ شائع کیا اور لاکھوں کی تعداد میں تقسیم ہوا۔ اقبال کی وفات کے بعد اس نئی بحث میں چند پرانے سوال اٹھائے گئے جو اقبال کی زندگی میں بھی زیر بحث آئے تھے، لیکن بعض سوال نئے تھے۔ سوال یہ تھے۔

۱- کیا اقبال نے ہندوستان کے وفاق کے اندر مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی یا وہ اسے ایک آزاد اور مقتدر مسلم مملکت کی صورت میں قائم دیکھنا چاہتے تھے۔

۲- اقبال نے خودمختار مسلم ریاست کی تجویز پیش تو کی تھی، لیکن بعد میں اس کی لغویت کو محسوس کرتے ہوئے اس سے انحراف کیا۔

۳- اقبال تنہا مسلم ریاست کے تصور کے خالق نہ تھے بل کہ ان سے قبل کئی ہندو' مسلم' انگریز

یادیگر شخصیتوں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے اسی قسم کی تجاویز پیش کر رکھی تھیں اور اقبال ان شخصیات میں سے ایک تھے۔ یہ سوال قیام پاکستان کے بعد بالخصوص پاکستان میں اٹھایا گیا۔ اس کا تعلق بظاہر تو علمی تحقیق سے تھا لیکن جیسا کہ واضح کیا جائے گا۔ اس کے پس منظر میں بعض مخصوص سیاسی مصلحتیں بھی برسرِ عمل تھیں۔''(۱۱)

اقبال کے تصور مسلم ریاست اور چودھری رحمت علی کے تصور کو باہم اُلجھانے کی بھی کوششیں ہوئیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے مسلم ریاست کے تصور اور چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم میں بنیادی اور اساسی نوعیت کا فرق تھا۔ اقبال نے مسلم ریاست کے قیام کا تصور ایک ذمہ دار سیاسی مدبر کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا۔ جب کہ چودھری رحمت علی کی تجویز ایک طالب علم کی تجویز تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان دونوں نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے باہمی اختلافات پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''اقبال کی خود مختار مسلم ریاست کسی قابلِ قبول ہندو مسلم مفاہمت کی بنیادوں پر ہندوستان کے وفاق' برطانوی سلطنت یا برطانوی دولت مشترکہ کے اندر قائم ہوسکتی تھی اور اس کا علیحدہ طور پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم ہونے کا امکان صرف اس صورت میں تھا' جب ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی امید نہ رہے لیکن چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اقبال کی مسلم ریاست کے قیام کی تجویز میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہ تھی' مگر چودھری رحمت علی کے تصور پاکستان میں آبادیوں کا تبادلہ لازمی تھا۔''(۱۲)

اس باب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے نہ صرف خطبۂ الٰہ آباد کے اجزائے ترکیبی پر مفصل بحث کی ہے، بل کہ ان سیاسی' سماجی اور مذہبی احوال و آثار کو بہ طور پس منظر برتا ہے کہ جن میں یہ تصور اجاگر کیا گیا' اس تصور کی اشاعت کے بعد' جس طرح مختلف لوگوں اور پریس نے اس کی مخالفت کی' اور علامہ کی کردار کشی کی' اس کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور خاطر خواہ جوابات دیے گئے ہیں۔ اس باب میں چودھری رحمت علی اور علامہ اقبال کے تصورات کے مابین جو اختلافات ہیں ان کی بھی وضاحت کی گئی ہے؟ اس طرح اقبال کے قائداعظم کے نام خطوط بھی زیر بحث لائے گئے ہیں اور اُن سے علامہ کے موقف کی صلابت اور صداقت کو بہتر انداز میں

سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس نوعیت کے تمام تر حوالوں سے اس باب کو مزین کیا ہے اور نہایت معقولیت کے ساتھ زیر بحث مسائل کو منطقی نقطۂ انجام تک پہنچایا ہے۔

۴) زندہ رُود جلد سوم کے چوتھے اور مسلسل اٹھارویں باب میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی مکمل داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ باب ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۱ء میں علامہ انگلستان گئے' جہاں انھوں نے گول میز کانفرنس کی کارروائیوں میں حصہ لیا۔ وہ اس سفر کے دوران کیمبرج کی علمی وادبی نشستوں میں بھی شریک رہے۔ انھوں نے دونوں گول میز کانفرنسوں میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی' وہ اس دورانیے میں فلسطین بھی گئے اور سپین کا سفر بھی کیا۔ ان کی نظمیں ذوق وشوق اور مسجد قرطبہ اس زمانے اور سفر کی یادگار ہیں۔ جاوید اقبال نے لکھا ہے:

''اقبال حکومت ہسپانیہ کی اجازت خاص کے تحت ناظم آثار قدیمہ کی معیت میں مسجد میں نماز ادا کرنے کی خاطر گئے تھے' اس لیے مصلیٰ ساتھ لے کر گئے اور عین ممکن ہے کہ یہ انتظام انھوں نے قیام میڈرڈ کے دوران پروفیسر آسین پیلا کیوس یا وزیر تعلیم حکومت ہسپانیہ کے ذریعہ کرایا۔ ان کے ہم راہ فوٹو گرافر بھی تھے' جنھوں نے نماز کی ادائیگی کے دوران اور بعد میں ان کی کئی تصویریں مسجد کے اندر کھینچیں' جو کئی بار اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں اور خاص مقبول ہیں۔ حکومت ہسپانیہ نے شاید اپنے ملک کے پراپیگنڈے کی خاطر انھیں یہ اجازت خاص دی تھی' لیکن جس کسی نے بھی مسجد قرطبہ کی زیارت کی ہے' اس نے دیکھا ہوگا کہ مسجد کے اندر اس کے لاتعداد ستونوں کے درمیان جگہ گھیر کر بیسیوں چھوٹے چھوٹے گرجے بنائے گئے ہیں' جو ابھی تک صاف نہیں کیے گئے۔ البتہ مسجد کا خوب صورت ترین حصہ محراب والا حصہ ہے' جو ستونوں سمیت تمام کا تمام سنہری ہے، کیوں کہ اس پر سونے کے جڑاؤ کام کیا گیا ہے اور وہ اب تک اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ مسجد سے باہر اس کے عالی شان مینار واحد پر' جو اذان کے لیے مخصوص تھا' اب گھنٹہ آویزاں ہے اور رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق دن میں خاص خاص وقتوں پر اسے بجایا جاتا ہے۔ مسجد قرطبہ اپنے عہد کی دیگر مساجد یا مسلمانوں کی عام عبادت گاہوں کی طرح خوب روشن اور تابندہ عبادت گاہ تھی (چراغ جلانے کے لیے تیل کا خرچ ۳۱۴ من اور موم بتیاں جلانے کے لیے'.....من موم اور ۳۴ سیر سوت سال بھر میں صرف ہوتا تھا) لیکن اب عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی طرح اس کی فضا تیرہ وتار ہے اور اس کے اندر بیٹھے ہوئے

بھاری آرگن کی کرخت موسیقی کے پس منظر میں اس کی ویرانی اور کس مپرسی سے خوف آتا ہے۔ رات کو مسجد کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ راقم نے رات کو مسجد کے گرد طواف کیا اور مخصوص وقفوں کے بعد انتہائی تاریکی میں مینار سے آویزاں گھنٹے کو بجتے سنا' تو یوں محسوس ہوا' گویا وہ ایک آسیب زدہ عمارت ہے۔ مسجد کی شان وشوکت اور حسن و جمال اور اس کے ساتھ اس کی ویرانی' کسمپرسی اور تیرہ و تار فضا کا منظر' ایک بار دیکھ کر کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا۔''(۱۳)

۵) جلد سوم کا پانچواں اور مسلسل انیسواں باب بہ عنوان 'افغانستان' سفر افغانستان سے متعلق ہے، جو ۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ علامہ اقبال کو افغانستان سے جو قلبی تعلق خاطر تھا' وہ ان کے جملہ مجموعہ ہائے کلام سے مترشح ہے۔ وہ افغانی مسلمان کو اسلام کی عظمت اور وقار کی علامت سمجھتے تھے۔ انھوں نے 'محراب گل افغان' کے علامتی پیرہن میں افغانی مسلمانوں کو درس حیات اور پیغام عمل دیا ہے۔ علامہ افغانوں کے جذبۂ جہاد اور انداز زندگی سے بے پناہ متاثر تھے۔ انھوں نے ہمیشہ افغانوں کے جذبۂ حریت اور شوق شہادت کو بہ نگاہ استحسان دیکھا ہے۔ جاوید اقبال نے اس باب میں علامہ کے سفر افغانستان کی تفاصیل قلم بند کی ہیں۔ اس سفر میں سر راس مسعود اور علامہ سیّد سلیمان ندوی بھی ان کے ہم سفر تھے۔ غایت سفر یہ تھی کہ افغانستان کے حکمران نادر شاہ نے ان حضرات کو تعلیمی امور کے ضمن میں صلاح ومشورے کے لیے بلوایا تھا۔ زندہ رُود میں علامہ کے تمام اسفار کی تفاصیل فراہم کی گئی ہیں۔ یہ سفر ان کی زندگی کا آخری سفر ہے۔ جاوید اقبال نے اپنے سادہ اور عام فہم انداز بیان میں اس سفر کی جملہ جزئیات کو بیان کیا ہے۔ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن اس سفرنامے کے انداز بیان کو سراہتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'' اس کتاب میں ان کے جتنے سفر نامے درج ہیں' ان کو سمیٹ کر علیحدہ کتاب میں شائع کر دیا جائے' تو یہ ایک مستقل کتاب ہو جائے گی۔ جو بہت لطف ولذت کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے۔ ان میں تفصیل اجمال اور اطناب و ایجاز دونوں کے مزے ملتے ہیں۔ جزئیات بھی سمیٹی گئی ہیں بعض غلط فہمیاں بھی دور کی گئی ہیں اور غلط بیانیوں کی تردید بھی کی گئی ہے، لیکن کسی لمحہ

یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی بیٹا خواہ مخواہ اپنے باپ کی مدافعت کر رہا ہے۔ اس میں معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس سفر و سیاحت کا مطالعہ کرتے وقت کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن بطوطہ اپنا ہی سفر نامہ مرتب کر رہا ہے۔ کبھی ایسا کہ لکھنے والا سفر کرنے والے کے ساتھ سایہ کی طرح رہا اور اس نے جو خود دیکھا، وہی سپردِ قلم کر دیا ہے۔''(۱۴)

علامہ اقبال نے یہ سفر ۱۹۳۳ء میں کیا۔ انھوں نے اس سفر کے مقاصد کی وضاحت فرماتے ہوئے ایک مقامی اخبار میں بیان دیا:

''تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہوسکتا ہے۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں منتقل کرنے کی اسکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیانی علاقہ میں آباد ہوشیار افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوگی۔ شاہِ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیرِ تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مشورہ دیں۔ ہم نے اس دعوت کو قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کابل میں شائع ہونے والے مختلف رسالوں سے پتا چلتا ہے کہ افغانوں کی نئی نسل نئے علوم کی تحصیل اور انھیں اپنے دین وتمدن کے سانچے میں ڈھالنے کی بے حد خواہش مند ہے۔ افغان فطرتاً بہت خلیق لوگ ہیں اور ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ہم انھیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرے ذاتی خیال میں خالص سیکولر تعلیم سے خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ بہرحال کسی نظام تعلیم کو قطعی نہیں کہا جاسکتا۔ ہر ملک کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور اُن ضروریات کی روشنی ہی میں اس کے نظامِ تعلیم کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

اقبال اور سیّد راس مسعود پشاور میں ٹھہرتے ہوئے ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے اور انھیں کابل کی نئی آبادی دارالامان کے شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ سیّد راس مسعود کے ہم راہ پروفیسر ہادی حسن بہ طور سیکرٹری آئے تھے اور اقبال کے سیکرٹری کی حیثیت سے غلام رسول خان بیرسٹر آئے ہیں۔ علی بخش بھی ان کی خدمت کے لیے حاضر تھے۔ دو تین روز میں تعلیمی معاملات کے متعلق مشورہ کے سلسلے میں چند اجلاس ہوئے، جن میں اقبال، سیّد راس

مسعود اور حکومت افغانستان کے بعض سرکردہ نمائندوں نے شرکت کی اور سیّد راس مسعود نے تمام کارروائی کے نوٹس بھی لیے، لیکن بدقسمتی سے ان حضرات کی تجاویز کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ میونسپلٹی نے ان کے لیے ایک دعوت چائے کا اہتمام کیا۔ اقبال سرور خان گویا کی معیت میں بابر کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے بھی گئے۔ بابر کا مقبرہ کابل سے باہر ایک ویران سی پہاڑی کے دامن میں ہے۔ چھوٹی سی عمارت ہے اور قبر پر ایک بے گنبد سقف سے کھڑی کی ہوئی ہے۔ بعدازاں اقبال اور سیّد راس مسعود کی ایک ملاقات نادر شاہ سے قصر دلکشا میں ہوئی۔ اس ملاقات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال نے نادر شاہ کو قرآن کریم کی ایک جلد تحفہ کے طور پر دی۔ اسی دوران عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی، مگر بہ قول ظہیر الدین، اقبال نے کہا۔

''نادر میں نے اپنی عمر کسی شاہ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزار دی ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں، تو کیا مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا، امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔''(۱۵)

اقبال اپنے قیام کے دوران میں مختلف شخصیات سے ملے اور مختلف مقامات کی سیر کی۔ وہ غزنی میں محمود غزنوی کے مزار پر حاضر ہوئے۔ حکیم سنائی اور بابر کی قبور پر گئے۔ حضرت داتا گنج بخش کے والد گرامی کے مزار مبارک کی زیارت کی۔ حکیم سنائی کے معاصر مجذوب لائے خوار کی قبر دیکھی، قندھار میں خرقہ شریف کا دیدار کیا، پھر چمن کے راستے ہندوستان مراجعت کی۔ سیّد سلیمان ندوی نے اپنے سفرنامے سیر افغانستان میں اس سفر کے تفصیلی حالات و واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کہ اقبال نے اس سفر کی یادگار کے طور پر مثنوی 'مسافر' کہی، جو ۱۹۳۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''فارسی مثنوی ایک غزل کے سوا، زیادہ تر مثنوی معنوی کی بحر میں ہے اور بہ قول سیّد سلیمان ندوی خیبر و سرحد و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر اقبال کے آنسو ہیں اور بابر، سلطان محمود، حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں۔ اس کا آغاز نادر شاہ شہید کے مناقب سے اور اختتام محمد ظاہر شاہ سے اظہار توقعات پر ہے۔''(۱۶)

۶) زندہ رُود جلد سوم کا چھٹا اور مسلسل بیسواں باب بہ عنوان ''علالت'' علامہ اقبال کی علالت کے مفصل تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس باب کے ۶۷ صفحات ہیں۔ جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

''۱۹۳۴ء کا سال علالت کے آغاز اور دیگر مصائب کے سبب ایک لحاظ سے اقبال کی سیاسی زندگی کے عملی طور پر خاتمے کا سال ہے' لیکن بہ قول محمد احمد خان بستر علالت پر لیٹے لیٹے انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ سازی میں جو کام انجام دیا' اسے اس خطۂ زمین کے مسلمانوں کا مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔''(۱۷)

علامہ اقبال کے آخری چار سال نہایت پریشانی میں گزرے۔ اس باب میں' ان تمام حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور علامہ کی علالت کی تمام تر تفصیلات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ وہ بیماری کے دنوں میں بھی ملت اسلامیہ کے دکھ میں برابر کے شریک رہے۔ ان کی آواز بند ہو گئی۔ بینائی پر اثر پڑا، گردے متاثر ہوئے، شوگر بڑھ گئی، سانس کے مسائل کا سامنا رہا، مگر ان کے ذہن کی قوتیں اور صلاحیتیں آخر تک قائم و دائم رہیں۔ وہ ان عوارض میں بھی علمی و شعری تخلیقات کے لیے وقت نکالتے رہے۔ قادیانیت کے سلسلے میں مضامین لکھے اور اخبارات کے لیے بیانات جاری کیے۔ جاوید اقبال نے اس نوعیت کی ساری تفاصیل فراہم کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

'' قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان میں مختصراً اقبال کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت کی بنیادیں مذہبی تصور پر استوار ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو' جو اپنی اساس ایک نئی نبوت پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ تمام مسلمان جو اس کا موقف قبول نہیں کرتے' وہ کافر ہیں' تو قدرتی طور پر ہر مسلمان ایسے گروہ کو ملت اسلامیہ کے استحکام کے لیے ایک خطرہ قرار دے گا اور یہ بات اس لیے بھی جائز ہوگی کہ مسلم معاشرے کو ختم نبوت کا عقیدہ ہی سالمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک قبل از اسلام مجوسیت کے جدید احیا نے جن دو تحریکوں کو جنم دیا' ان میں ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے اعلانیہ علیحدگی کا رستہ اختیار کرتی ہے۔ لیکن قادیانیت اسلام کے بعض اہم ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی روح اور نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق 'بروز' حلول اور ظل کی اصطلاحات مسلم ایران میں اسلام سے منحرف تحریکوں نے اختراع کیں اور مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ آخر

میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیں۔

اس بیان پر احمدی اخباروں نے کئی اعتراض کیے اور اقبال پر مختلف قسم کے الزام لگائے۔ ہفتہ وار لائیٹ کے نمائندے نے ان کی توجہ ایک اور احمدی ہفتہ وار سنرائز کی طرف مبذول کراتے ہوئے سوال کیا کہ اس اخبار کے مطابق انھوں نے اپنے کسی گزشتہ خطبے میں احمدیت کے متعلق مختلف رائے کا اظہار کیا تھا۔ سو، ان کے اب کے بیان اور خطبہ میں تناقض کیوں ہے۔ اقبال کا جواب تھا کہ وہ یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ اب سے ربع صدی پیشتر انھیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع تھی، لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں ظاہر نہیں ہو جاتی، بل کہ اپنے مکمل اظہار کے لیے کئی عشرے لیتی ہے۔ اس تحریک کے دو گروہوں کے درمیان اندرونی اختلافات بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ جو لوگ بانیٔ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، انھیں بھی یہ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر تحریک نے کیا صورت اختیار کرنی ہے۔ درخت کو جڑ سے نہیں اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پس اگر ان کے رویہ میں کوئی تناقص ہے، تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے.....۔

اقبال نے اسٹیٹسمین کے لیڈنگ آرٹیکل میں اپنے بیان پر تبصرہ کا جواب ایک خط کے ذریعہ دیا، جو ۱۰؍جون ۱۹۳۵ء کو اسٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ جواب کے اہم نکات یہ تھے:

اول یہ کہ: برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے کسی رسمی عرض داشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انگریزی، حکومت کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے، جیسے کہ سکھوں کو ۱۹۱۹ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا، مگر بعد میں بغیر ان کی طرف سے کسی رسمی عرض داشت کی وصولی کے انھیں ایسا تصور کیا گیا، باوجود اس کے کہ ہائی کورٹ لاہور کے فیصلہ کی رو سے سکھ کوئی علیحدہ مذہبی فرقہ نہیں، بل کہ ہندو تھے۔ دوم یہ کہ: احمدیوں کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو بہائیوں کی طرح مسلمانوں سے اپنے آپ کو خود مذہباً الگ کر لیں یا مسئلۂ ختم نبوت کے متعلق اپنی تمام تاویلات مسترد کر کے اسلامی مؤقف قبول کریں۔ آخر دائرۂ اسلام میں رہتے ہوئے ان کا اسلام کے منافی تاویلات اپنانے میں اور کیا مقصد ہو سکتا تھا، سوائے اس کے کہ سیاسی فائدہ

اٹھایا جائے۔سوم یہ کہ: (اور یہ نکتہ خصوصی اہمیت رکھتا تھا) احمدیوں کو علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دینے میں اگر انگریزی حکومت نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانان برصغیر یہ شک کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انگریزی حکومت جان بوجھ کر اس مذہبی فرقہ کو اس وقت مسلمانوں سے الگ نہ کرے گی، جب تک احمدیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو جاتا، کیوں کہ فی الحال احمدی اپنی تعداد میں کمی کے سبب پنجاب میں سیاسی طور پر مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک چوتھا مذہبی فرقہ بن سکنے کے قابل نہ تھے، لیکن اگر ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو وہ پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو صوبائی لیجسلیچر میں شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔ پس اگر انگریزی حکومت ۱۹۱۹ء میں سکھوں سے کسی رسمی عرض داشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انھیں ہندوؤں سے الگ مذہبی فرقہ تسلیم کر سکتی ہے تو اس ضمن میں اسے احمدیوں کی طرف سے کسی رسمی عرض داشت کی وصولی کا انتظار کیوں ہے۔

پندرہ روزہ اخبار اسلام کے نمائندے نے اقبال کی توجہ مرزا بشیر الدین محمود کے ایک خطبۂ جمعہ کی طرف دلائی جس میں ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے احمدیوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں جیسے رومیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے حوالے کر دیا تھا اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا۔ اقبال نے اپنے جواب مورخہ ۲۲/جون ۱۹۳۵ء میں جو اس اخبار میں شائع ہوا۔ واضح کیا کہ ان کے گزشتہ بیان میں ایسا کوئی فقرہ موجود نہ تھا۔ البتہ انھوں نے یہ کہا تھا کہ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں، جتنی یہود کو رومی سلطنت میں حاصل تھی۔ کیوں کہ رومی اس بات کے پابند تھے کہ یہود کی مجلس امور مذہبی میں جو فیصلہ ہوگا وہ دیکھیں گے کہ اس کی تعمیل قطعی طور پر ہو جاتی ہے۔

'طلوع اسلام' بابت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں نذیر نیازی نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کی بعض تحریروں کے اقتباسات پیش کیے جس میں انھوں نے نبوت کے دو اجزا پر بحث کی تھی، یعنی نبوت روحانیت کے ایک خاص مقام کی حیثیت سے اور نبوت ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے جو نئی اخلاقی فضا تخلیق کر کے انسانوں میں سیاسی اور معاشرتی تغیر کا سبب بنے۔ بہ قول اقبال اگر دونوں اجزا موجود ہوں تو وہ نبوت ہوگی اور اگر صرف پہلا جز و موجود ہو تو تصوف یا ولایت۔ اقبال نے تحریر کیا:

''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت

کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے''۔

بالآخر احمدیوں کی حمایت میں پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اس بحث میں کود پڑے اور انھوں نے اپنے تین انگریزی مضامین بہ عنوان 'اتحاد اسلام' اقبال کے مضمون پر تبصرہ میں جو کلکتہ کے رسالے ماڈرن ریویو میں نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے اقبال کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے ان کے مضامین کا ایک نہایت جامع جواب بہ عنوان 'اسلام اور احمدیت' تحریر کیا جو اسلام مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس طویل جوابی مضمون میں بھی جو کئی بار چھپ چکا ہے، انھوں نے مسئلہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں کے مؤقف کی وضاحت کی۔ نیز ثابت کیا کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب ملائیت، تصوف اور مطلق العنان سلطنت ایسی منفی قوتیں تھیں۔ پھر جدید ترکی میں سیکولر اصلاحات کی مدافعت میں تحریر کیا کہ وہ اسلام کے منافی نہیں ہیں۔ آخر میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے اس ریمارک' کہ ان کے خیال میں سر آغا خان بھی صحیح العقیدہ مسلمان نہیں سمجھے جاتے' کے جواب میں اقبال نے آغا خان ہی کی ایک تقریر کا حوالہ دیا، جس میں انھوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی تھی کہ تم سب مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ ہی رہ سکتے ہو۔ لہٰذا اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو؛ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مساجد میں نماز ادا کرو؛ روزے باقاعدہ رکھو؛ اسلامی شریعت کے اُصولوں کے مطابق شادیاں کرو اور سب مسلمانوں کو اپنے بھائی سمجھو۔ اس مضمون کا پورا احاطہ کرسکنا تو یہاں ممکن نہیں۔ لیکن اقبال کا درج ذیل نکتہ یقیناً خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

ظاہر ہے ایک ہندوستانی قوم پرست (یعنی پنڈت نہرو) جس کے سیاسی آئیڈیلزم نے اس کی حقیقت کو پرکھنے کی حس کا خاتمہ کر رکھا ہے۔ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں حق خود ارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ غلط ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم کے فروغ کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ مختلف ثقافتی وحدتوں کو مکمل طور پر کچل دیا جائے۔

بالآخر اپنے خط بنام پنڈت جواہر لعل نہرو مورخہ ۲۱ر جون ۱۹۳۶ء میں اقبال نے احمدیوں کے سیاسی رویہ کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا۔ میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔''(۱۸)

علامہ بہت حقیقت پسندانہ مزاج کے حامل بزرگ تھے۔ انھوں نے بیماری کے ایام میں

اپنا وصیت نامہ لکھا اور بچوں کے لیے ایک لائحہ عمل متعین کیا۔ ان کی جائیداد وغیرہ کے سلسلے میں مسائل کو حل کیا اور اُن کے گارڈین بنائے۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا گیا وصیت نامہ ملاحظہ ہو:

''منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا، لاہور کا ہوں۔ اس وقت بہ قائمی ہوش وحواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چوں کہ میری ہر دو اولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی' اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائیداد وذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے:

۱- خواجہ عبدالغنی' ماموں حقیقی نابالغاں

۲- شیخ اعجاز احمد' سب جج' برادرزادۂ من مقر

۳- چودھری محمد حسین ایم اے' سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور

۴- منشی طاہر الدین جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور اُن کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔

اس وصیت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات و جائیداد کا ولی مقرر کرتا ہوں، تمام امور متعلقہ ذات و جائیداد نابالغاں کا انتظام اولیا مذکور کثرت رائے سے کیا کریں گے' لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائیداد کا ولی ہوگا اور اس کی جائیداد وذات کے متعلقہ انتظام خود بہ طور ولی کرے گا۔ اگر ان اولیا مقررکردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے، تو اس صورت میں باقی اولیا کو اختیار ہوگا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں۔ اگر کسی معاملہ میں اولیائے مذکورہ کی رائے مساوی نہ ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو اسی پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

اس وقت جو ملکیت کی چیزیں ہیں' مندرجہ ذیل ہیں:

کتب فلسفہ ولٹریچر وغیرہ ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے معہ [مع] مسودات' مثنوی مولانا روم' فارسی و انگریزی' مرتبہ ڈاکٹر نکلسن' دیوان مرزا عبدالقادر بیدل قلمی، مراۃ المثنوی (مولانا روم' مطبوعہ حیدر آباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف' باقی اور مسودات وکاغذات میں نے جاوید کو بہ طور یادگار دے دیے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔ باقی میرا اسباب مثلاً دو قالین برنگ سرخ و دری وصوفہ و کرسیاں وبکس اور پہننے کے کپڑے ہیں۔ ان کی

نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔

محمد اقبال، بیرسٹر ایٹ لا
لاہور۔ بقلم خود، ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۵ء

مکرر آنکہ:
اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائیداد کے انتظام یا کسی اور جائیداد کی خرید وغیرہ کے لیے اولیا کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرت رائے سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں۔ دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلد ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہ کا مقلد ہوں، بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیا مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں۔

محمد اقبال، بیرسٹر ایٹ لا
۱۳/اکتوبر ۱۹۳۵ء"(۱۹)

۷) کتاب زندہ رُود کے آخری باب کا عنوان آخری ایام ہے، جو تسلسل میں اکیسویں نمبر پر ہے، سڑسٹھ صفحات کو محیط، علامہ کے آخری ایام کا احاطہ کرتا ہے۔ علامہ کے آخری دو تین سال کس طرح گزرے اور انھیں کس نوعیت کے مسائل کا سامنا رہا۔ تفصیل کے ساتھ اس باب میں موجود ہیں۔ جاوید اقبال کی نظر جزئیات پر بھی رہی ہے۔ شاید ہی اس دورانیے کے کسی واقعہ کا ذکر یہاں موجود نہ ہو۔ اہم نوعیت کے سارے واقعات، جزئیات سمیت سپردِ قلم ہو گئے ہیں۔

اس زمانے کا اہم ترین واقعہ جو وفات سے دو چار ہفتے قبل پیش آیا، وہ مولانا حسین احمد مدنی کے ساتھ وطنیت کے تصور پر اُصولی بحث کے ضمن میں تھا۔ علامہ بستر مرگ پر پڑے تھے، مگر انھیں گوارا نہیں تھا کہ اتنا بڑا عالم دین ایک غلط مؤقف کی حمایت اور تائید کرے، سو انھوں نے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ یہ بحث بہت دیر تک جاری رہی اور اس کے بڑے دُور رَس اثرات مرتب ہوئے۔ وہ اپنی وفات تک علمی اور ادبی معاملات میں متحرک رہے۔ ان کا

فکری پایہ بہت بلند تھا۔ اپنے آخری ایام میں وہ جن مسائل پر غور وفکر کرتے رہے' جاوید اقبال نے ان الفاظ میں ان کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے:

''احیائے تمدن اسلام کے لیے جس طرح دینیات کے شعبہ میں نئے علم الکلام اور قانون کے شعبہ میں نئی فقہ کی تشکیل کی ضرورت تھی، اسی طرح تعلیم کے شعبہ میں انقلابی تبدیلیاں درکار تھیں۔ اس میدان میں اقبال قدیم اور جدید کا امتزاج چاہتے تھے۔ وہ برصغیر کے مفکروں میں پہلی شخصیت تھے جس نے جدیدیت اور مغربیت میں امتیاز واضح کیا۔ وہ بنیادی طور پر مغربیت کے تو مخالف تھے، لیکن جدیدیت یا تجدید کے ہمیشہ قائل رہے۔ ان کے نزدیک علم کی تحصیل کے لیے خداوند تعالیٰ نے انسان کو تین ذرائع سے نوازا ہے: عقل' حواس خمسہ اور عرفان۔ عقل سے حاصل کردہ علم کی نوعیت فکری تھی اور اس کا ماہر عالم کہلاتا تھا۔ حواس خمسہ سے حاصل کردہ علم کا انحصار مشاہدے یا تجربے پر تھا اور اس کا دوسرا نام حکمت یا سائنس تھا۔ حکمت یا سائنس کے ماہر کو روایتی انداز میں حکیم کہا جاتا تھا۔ عرفان کے ذریعہ سے حاصل کردہ علم دراصل معرفت کہلاتا تھا اور اس کے ماہر کو لوگ عارف کہہ کر پکارتے تھے۔ اقبال کے خیال میں محض دینی علوم کو تجدید سے مسلمانوں کے تمدنی احیا کا امکان نہ تھا، اس لیے وہ ایسے دارالعلوم کے قیام کے خواہش مند تھے جہاں مسلم طلبہ کو قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بالخصوص سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم بھی دی جائے۔ اقبال کی رائے میں مسلمان جدید سائنس کے موجد تھے اور اس میدان میں ترقی کرنا ان کے لیے اشد ضروری تھا تاکہ دُنیائے اسلام میں تحقیق' تخلیق' اختراع اور ایجاد کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا جاسکے۔ تربیت کے معاملے میں اقبال جدید مسلم یونیورسٹیوں کے اخلاقی معیار کو کچھ اس طرح متعین کرنا چاہتے تھے کہ وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے کو ایک نظر دیکھتے ہی کہا جاسکے کہ وہ اسلامی شخصیت اور کردار کا مالک ہے۔ اقبال ائمۂ مساجد اور واعظین سے بھی توقع رکھتے تھے کہ دینی علوم سے شناسا ہونے کے علاوہ وہ ادبیات اور جدید علوم سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ اقبال نے اپنی تحریروں کے ذریعہ شعر و ادب کی خصوصیتوں کے بارے میں تنقید کا ایک اسلامی معیار متعین کیا۔ نیز اسلامی آرٹ (فن) کے متعلق بھی اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

کسی قوم کی روحانی صحت کا انحصار اس امر پر موقوف ہے کہ اس کے شاعروں اور فنکاروں کو کس قسم کی آمد ہوتی ہے۔ جہاں تک تاریخ تمدن اسلامی کا تعلق ہے' میری دانست میں' ماسوا فن تعمیر کے اسلامی آرٹ (موسیقی' مصوری اور شاعری تک) نے ابھی وجود میں آنا ہے۔

اقبال نے اسلام کی اقتصادی یا معاشی تعلیمات کے متعلق بھی ذاتی اجتہاد کے ذریعہ ایک رائے قائم کر رکھی تھی جس کا اظہار وقتاً فوقتاً اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں میں فرماتے رہے۔ اگر اقبال کے معاشی نظریات کا احاطہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کارل مارکس کی تاریخ انسانی کی مادی تعبیر کو سراسر غلط تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بالشویک' کیمونسٹ یا سوشلسٹ عقیدہ رکھنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' جاگیرداری اور سرمایہ داری کے مخالف تھے اور ایسی اجارہ داریوں کو تعلیمات قرآنی کے برعکس سمجھتے تھے ان کے تصور ریاست سے عیاں ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی نظام جمہوریت میں کسی ایک مخصوص طبقہ کی حکمرانی' خواہ وہ جاگیرداروں یا سرمایہ داروں پر مشتمل ہو، خواہ مزدوروں یا کاشتکاروں پر، کی گنجائش نہ تھی۔ ان کی رائے میں اسلام کا مقصد ایک ایسے متوازن معاشی نظام کا انعقاد تھا، جس میں کوئی ایک دوسرے کے استحصال کا باعث نہ بن سکے۔ اسی بنا پر اسلام کیپٹلزم (سرمایہ داری) اور سوشلزم (اشتراکیت) دونوں کو انسانی فکر کی انتہا پسندی کے مظاہر سمجھتے ہوئے انھیں انسانی زندگی کے لیے ناقص و فاسد قرار دیتا ہے اور انسانی مساوات و اُخوت کے نصب العین کے حصول کی خاطر اپنا معاشی نظام' اقتصاد کی بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ جس سے مراد ہے اعتدال کے ذریعہ سرمایہ اور محنت کا صحیح توازن برقرار رکھنا۔ اقبال ذاتی ملکیت کے بنیادی انسانی حق کو وقف کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کسی فرد کو اسی قدر مال اکٹھا کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ حقیقی پیدا کاروں کو مغلوب کرے۔ پس اگرچہ اقبال سرمایہ داری کے مخالف تھے وہ معاشی نظام سے سرمایہ کی قوت کو قطعی طور پر خارج کرنے کے حق میں نہ تھے بل کہ ان کے نزدیک اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قرآنی تجاویز پر عمل کرنا ضروری تھا۔ اس ضمن میں وہ ایسے قوانین کا نفاذ چاہتے تھے جن سے اجتماعی حقوق نظر انداز کر کے دولت خزانہ کرنا (ارتکاز) ناجائز و وسائل معیشت سے مال اکٹھا کرنا (احتکار) سود لینا (ربا) یا سٹہ لگانا (قمار) حرام وممنوع دیے جاسکیں، نیز ان کے نزدیک قانون وراثت کا نفاذ اور زکوٰۃ' صدقہ اور عشر کی وصولی کا اہتمام کرنا ضروری تھا۔ اقبال کی رائے میں زمین کا اصل مالک خدا تھا اور انسان ایک امین کی حیثیت میں اس سے رزق حاصل کرسکتا تھا۔ ان کے نزدیک اراضی کی ذاتی ملکیت کی اجازت صرف اس حد تک دی جاسکتی تھی جو زمیندار بجائے خود زیر کاشت لاسکے۔ اسی طرح حکومت کی تحویل میں اراضی میں سے نصف کاشتکاروں میں اقساط کی صورت میں فروخت کر دینے کے حق میں تھے۔

مزید برآں زرعی آمدنی پر اسی تناسب سے ٹیکس وصول کرنے کے حامی تھے، جس طرح انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور جس طرح ایک متعین حد تک آمدنی والے انکم ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیے جاتے ہیں۔ اسی تناسب سے وہ چاہتے تھے کہ چھوٹے زمینداروں کو مالیہ یا لگان معاف کر دیا جائے۔ اقبال کو مزدوروں اور کاشتکاروں کی مشکلات کا پورا احساس تھا اور اُن کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے، لیکن آپ نے انھیں ہمیشہ یہی تلقین کی کہ بحیثیتِ مسلمانوں کے اپنی حقیقت اور مقام کو پہچانیں، قرآن کی اقتصادی تعلیمات پر نظر غائر ڈالیں اور کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔ پس وہ کیپٹلسٹ اور سوشلسٹ دونوں قسم کے استعمار کے تو مخالف تھے، لیکن دو مخلوط معیشت' کے اُصول پر مبنی اسلامی معاشی جمہوریت کے قیام کے خواہش مند تھے، یعنی ایسی معیشت جس میں مخصوص صنعتوں پر مشتمل پبلک سیکٹر میں سرمایہ لگانے کا اہتمام حکومت خود کرے (بجائے قومیانے یا غصب کی پالیسی کے) اختیار کرنے کے اور ساتھ نجی کوشش کو بھی ایک متعین حد تک قبول کیا جائے۔ نیز اقتصاد یا دولت کی مساویانہ تقسیم کے تصور کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کی خاطر اراضی کی حد ملکیت خود کاشت کے اُصول پر مقرر کرنے کے حامی تھے۔

طرزِ حکومت کے متعلق بھی اقبال کے نظریات قابلِ توجہ ہیں۔ وہ ہر قسم کی موروثیت یا آمریت کے مخالف تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک ایسا نظام' اللہ کی مطلق حاکمیت کے تصور یا اسلامی تعلیمات کے منافی تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اموی دور کو عرب امپیریلزم یا آمریت کا عہد قرار دیا ہے۔ جمہوری طرزِ حکومت پر ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا اعتراض خالصتاً اخلاقی اور اُصولی تھا کیوں کہ اس میں انتخاب کی بنیاد ووٹروں کی گنتی پر رکھی جاتی ہے اور اس گنتی میں ایک صحیح یا مناسب امیدوار محض ایک ووٹ کم پڑنے سے کسی غلط یا غیر مناسب امیدوار کے مقابلے میں شکست کھا سکتا ہے۔ جمہوری نظام کے اس سقم کا اعتراف ہر سیاسی مفکر نے کیا ہے اسی طرح وہ برصغیر میں ایسے جمہوری نظام کے انعقاد کے بھی خلاف تھے، جس سے مسلمان من حیث القوم ایک اقلیت میں منتقل کر دیے جائیں نیز انھیں یہ خدشہ تھا کہ کسی بھی پس ماندہ ملک میں جس کے عوام زیادہ تر ان پڑھ غیر منظّم اور فاقہ کش ہوں۔ وہاں جمہوریت کا تعارف سیاسی ابتری' معاشی تباہی' قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے، لیکن کسی بہتر طرزِ حکومت کی عدم موجودگی میں یا اس کے نعم البدل کی عدم موجودگی میں اقبال جمہوری طرزِ حکومت ہی کو موزوں طریق سمجھتے تھے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے صوبائی کونسل کے انتخابات

میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری اور صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر اور ۱۹۳۲ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے صدر رہے۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ان کی سیاسی زندگی میں بعض ایسے مراحل بھی آئے۔ جب انھوں نے محمد علی جناح سے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے منافقانہ کردار کے مسئلہ پر اختلاف کیا، لیکن محمد علی جناح کے حکم بحیثیتِ صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی تعمیل کرتے ہوئے اس پارٹی کے خلاف اپنا بیان (فروری ۱۹۳۸ء) اشاعت عام سے روک دیا اور یوں پارٹی ڈسپلن کی ایک نادر مثال قائم کی، اس مرحلہ پر یہ بیان دینا ضروری ہے کہ اقبال نہ تو مغرب کے سیکولر جمہوری نظام کے حامی تھے، نہ آج کے دور میں اسلام کے روایتی تصور ریاست (یعنی خلافت) کو کوئی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے ذہن میں جو دستوری خاکہ تھا اسے جمہوریت کی بنیاد پر ایک جدید اسلامی دستور کا خاکہ سمجھا جاتا ہے۔ سنی ممالک کی مجالس آئین ساز سے باہر نامزدگی کے اُصول پر علما کے بورڈ یا ان پر مشتمل کونسل کو وجود میں لایا جاسکتا تھا' جن کے اسلامی آئین ساز کے متعلق مشوروں سے منتخب اسمبلیوں کے اراکین استفادہ کر سکتے تھے' مگر اقبال اس طریق کار کو بھی صرف عارضی طور پر اختیار کرنے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں بہتر صورت یہی تھی کہ مجلس آئین ساز، جسے اقبال اجماع ملت کا اسٹیٹس دینا چاہتے تھے' میں ایسے وکلا منتخب ہو کر آئیں جو جدید جورسپروڈنس سے شناسائی کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی کے اُصولوں سے بھی واقفیت رکھتے ہوں' تا کہ قانون سازی کا کام وقت کے جدید تقاضوں اور قوم کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق انجام دیا جاسکے۔

اقبال کے ہاں اسلام کا تصور شوکت کے بغیر نامکمل ہے۔ اسی بنا پر وہ برصغیر میں اسلام کو صحیح معنوں میں آزاد اور مسلمانوں کو طاقت ور دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے برصغیر کے منتشر مسلمانوں کے سامنے مسلم قومیت کا اُصول رکھا اور اسی اُصول کی بنیاد پر ہی ان کے لیے شمال مغرب میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی۔ گو یہ تجویز مختلف فکری مراحل میں سے گزری، لیکن جیسے کہ اقبال کے خطوط بنام محمد علی جناح سے ظاہر ہے کہ اس کی حتمی شکل یہی تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں کے وفاق پر مشتمل ایک ایسی آزاد و مقتدر معاشی جمہوریت قائم کی جائے، جسے شریعت اسلامیہ کی تائید حاصل ہو۔ بہ الفاظ دیگر اقبال برصغیر میں آزاد و مقتدر مسلم ریاست کو ایک جدید اسلامی ریاست کی صورت میں قائم دیکھنا چاہتے تھے کیوں کہ ایسی ہی ریاست میں وہ نیا مسلم معاشرہ نمو پا سکتا تھا۔ جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا اور جس کے

افراد نے مستقبل میں مسلمانوں کی قیادت اور رہبری کے فرائض انجام دیے تھے۔ مگر اقبال کے نزدیک برصغیر میں آزاد ومقتدر جدید اسلامی ریاست کا قیام بجائے خود آخری مقصد نہ تھا، بل کہ یہ بھی محض ایک ذریعہ تھا اسلامستان کو وجود میں لانے کا اقبال کا خیال تھا کہ ہندی مسلمان مادی طور پر تو شاید عالم اسلام کی کوئی مدد کر سکنے کے قابل نہ تھے، لیکن ذہنی طور پر یقیناً ان کی خدمت کر سکتے تھے۔ اسی سبب اقبال ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ مسلم ممالک کے اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ اقبال، سیّد جمال الدین افغانی کے بڑے مداح تھے اور انھیں زمانہ حال کا مجدد سمجھتے تھے' فرماتے ہیں:

زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر وایران وترکی وہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ موخر الذکر ہی اصل میں مؤسس ہے۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا، یا انھوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق، اہلِ بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔

سیّد جمال الدین افغانی کے تصور اتحاد ممالک اسلامیہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کی رائے تھی کہ اولاً ہر مسلم ملک کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے اور اپنے آپ کو انفرادی طور پر مستحکم اور مضبوط بنانا چاہیے، مگر ہر ایک کا نصب العین یہی ہونا چاہیے کہ بالآخر آزاد مسلم ریاستوں کے ایک زندہ خاندان کی طرح سب متحد ہو جائیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام نہ تو نیشنلزم ہے، نہ امپریلزم، بل کہ ایک طرح کی جمعیت اقوام ہے۔ اقبال کے خیال میں مسلم ممالک کا اتحاد تین صوبوں میں وجود میں لایا جاسکتا ہے۔ دوسری صورت میں مسلم ممالک پر مشتمل فیڈریشن یا کنفڈریشن ہے اور اسے بھی وجود میں لاسکنا' شاید محال ہو۔ تیسری صورت انفرادی مسلم ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ تمدنی' اقتصادی اور عسکری معاہدوں میں منسلک ہونا ہے۔ یہ صورت زیادہ قرین قیاس ہے اور اسی اُصول کی بنا پر رفتہ رفتہ تمام آزاد مقتدر مسلم ریاستیں ایک دوسری کے قریب لائی جاسکتی ہیں۔ اقبال کی رائے میں مسلم ممالک کا اتحاد دو صورتوں میں ختم ہوسکتا ہے۔ اس خاتمے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی ملک کے مسلمان ہی اپنے ایمان سے منحرف ہو کر کوئی اور عقیدہ قبول کر لیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ جب ایک مسلم ملک دوسرے مسلم ملک پر حملہ کر دے۔ اقبال کو یقین تھا کہ رفتہ رفتہ ایسی صورت حالات پیدا ہو رہی ہے کہ عالم اسلام کا اتحاد کسی نہ کسی ہیئت میں بالآخر ایک سیاسی یا جغرافیائی حقیقت بن جائے گا مگر اس

اعتبار سے بھی اقبال آئندہ یا مستقبل کے مفکر تصور کیے جائیں گے، کیوں کہ عالم اسلام کے اتحاد کی جو تصویر ان کی نگاہوں کے سامنے ابھری تھی' ابھی تک اس کے دھندلے سے آثار بھی نمودار نہیں ہوئے اور سب کچھ گرد وغبار میں اٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہ سب تو فکرِ اقبال کے خالصتاً اسلامی پہلو تھے، لیکن چوں کہ اقبال کے ہاں اسلام دراصل انسان کا انکشاف ہے، اس لیے ان کے فکر کے انسانی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا پیغام خودی صرف مسلمانوں ہی کے لیے وقف نہ تھا بل کہ ہندوؤں اور ان سب اقوام کے لیے بھی تھا جو پس ماندہ تھیں یا مغربی نو آبادیاتی اور استعماری قوتوں کے سیاسی و اقتصادی استحصال کا شکار تھیں۔ اس ضمن میں ان کی تصانیف میں سب سے اہم پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ہے۔ اقبال نے پس ماندہ اقوام کی جدوجہد آزادی کی ہر مرحلے پر حمایت کی۔ انھیں خود اعتمادی اور اپنی حقیقت کو پہچاننے کا سبق دیا، انھیں اپنے اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر مستحکم ہونے' مغربی طاقتوں پر انحصار نہ کرنے' اور آپس میں اتحاد قائم رکھنے یا ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات کی صورت میں جنگ وجدل کے بجائے پر امن گفت وشنید کے ذرائع اختیار کر کے اختلافات نپٹانے کی تلقین کی۔ اقبال کا خیال تھا کہ متمول مغربی اقوام کے سیاسی واقتصادی استحصال سے محفوظ رہنے کی خاطر ممکن ہے، پس ماندہ اقوام کو کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی ایک علیٰحدہ 'جمعیت اقوام' وجود میں لانے کی ضرورت پڑے اور اس سلسلہ میں انھوں نے تجویز کیا کہ جغرافیائی طور پر تہران کو ایسی مرکزیت حاصل ہے۔ جہاں ایسا ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

اقبال کیپٹلسٹ اور سوشل امپریلزم دونوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں یورپی اقوام نے ایک اعلیٰ کلچر کی بنیاد رکھی، مگر ان کا عمل چوں کہ اس کلچر کے مقتضیات کے خلاف تھا، اس لیے غالب امکان تھا کہ یہ کلچر چند عالمی جنگوں میں بیکار ہو کر فنا ہو جائے گا۔ اقبال نے اپنی شعری تخلیقات اور نثری تحریروں میں مغرب کی نو آبادیاتی اور استعماری اقوام کو بار بار تنبیہہ کی کہ وہ احترام آدمیت کے اُصول کو اپنائیں، ورنہ ان کا نام ونشان مٹ جائے گا۔

ان کی نگاہ میں مغرب کا جدید انسان معذوری کی کیفیت میں تھا۔ فرماتے ہیں:

جدید انسان اپنے تنقیدی فلسفوں اور سائنسی علوم میں اختصاص کے سبب بڑی ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ اس کی نیچر پرستی نے تو بے شک اسے یہ صلاحیت بخشی کہ قوائے فطرت کی تسخیر کرے، مگر اپنے مستقبل میں اس کے اعتماد کا جذبہ چھین کر۔ پس اپنی ذہنی سرگرمیوں کے نتائج سے مغلوب ہونے کے سبب جدید انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور نظریات کی جہت میں اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم

ہے اور اقتصادی و سیاسی سطح پر وہ دوسروں سے مصروف پیکار ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابلِ تسکین جوع زر پر قابو حاصل سکے۔ اسی بنا پر زندگی کے اعلیٰ مراتب کے لیے اس کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے۔ بل کہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ حقیقت زندگی ہی سے بیزار ہو چکا ہے۔

اسی سلسلہ میں اقبال نے اپنے تصورِ شیطان میں چند اچھوتے خیالات کا اظہار کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ شیطان سیاسی و اقتصادی سطح پر عالمی ناقدین یا سیاست دانوں سے کیا کام لیتا ہے اور کس طرح انھیں استعمال کر کے انسان کے ہاتھوں انسان کا خون بہاتا ہے۔ اقبال نے اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر نئے سال کے لیے اپنے آخری پیغام میں واضح کر دیا تھا کہ اس دُنیا میں انسان کی بقا انسانیت کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھنے ہی سے ممکن ہے اور صرف وہی اتحاد قابلِ اعتماد ہے جس کی بنیاد اُخوتِ انسانی پر رکھی گئی ہو۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ جب تک نسل، رنگ اور علاقائی قومیتوں کے امتیازات قطعی طور پر مٹا نہیں دیے جاتے اور اُخوت کے حسیں تخیل کو کبھی بھی حقیقت کا جامہ نہ پہنایا جا سکے گا۔ انھوں نے یہ پیغام اس دُعا پر ختم کیا تھا کہ خداوند کریم عالمی لیڈروں کو انسانیت اور نوع انسان کی محبت عطا فرمائے۔

عجیب بات ہے کہ اس ضمن میں اقبال کے خیالات کی بازگشت آج کی دُنیا کے لبرل مفکروں کے ہاں بھی سنائی دینے لگی ہے''۔(۲۰)

زندہ رُود صرف علامہ اقبال کے احوال و آثار کا تذکرہ نہیں۔ بل کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے برصغیر کی مفصل تاریخ بھی ہے۔ سعشہ خان نے ٹھیک ہی تو کہا ہے:

زندہ رُود میں اقبال کی سوانح تاریخی، سیاسی، نفسیاتی حقائق کے ساتھ، پیش کی گئی ہے۔ ان کا اُسلوب اول تا آخر ادبی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کہیں پر بھی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ جاوید اقبال نے اقبال کی شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اقبال کے فکری ارتقا کا جائزہ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۳۸ء تک کے عہد میں رکھ کر لیا ہے اور ساتھ ہی ستر (۷۰) سالوں پر مشتمل اس دور کی سیاسی تاریخ اور سماجی داستان بھی بیان کی ہے، جس کے لیے انھوں نے ایک اچھے سوانح نگار کی طرح تمام مستند کتب سے استفادہ کیا ہے اور قارئین کی سہولت کے لیے ان تمام مآخذ کو ہر جلد کے آخر میں ابواب کی ترتیب سے Chapter Wise تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ جاوید اقبال نے اس سلسلۂ کتب میں بعض نئی باتیں بھی بیان کی ہیں، جن کا ذکر ان سے پہلے کسی سوانح نگار نے نہیں کیا تھا''۔(۲۱)

زندہ رُود جلد سوم میں بھی دوسری جلدوں کی طرح تحقیقی ولسانی اغلاط ملتی ہیں۔ چند ایک غلطیوں کی نشان دہی بہ طور نمونہ حسبِ ذیل ہے:

۱-'' رستہ میں مُلّا قربان کی نشاندہی پر مختلف ٹیلوں پر انھوں نے بہلول دانا' سلطان ابراہیم اور سلطان محمود کے والد سلطان سبکتگین کے مزار دیکھے۔''(۲۲)

علامہ اپنے دورۂ افغانستان میں سلطان سبکتگین کے مزار پر نہیں گئے۔ فاضل مصنف کو اشتباہ ہوا ہے، وہ سلطان محمود غزنوی کے مزار پر گئے اور داتا گنج بخش کے والد گرامی کے روضے کی زیارت کی۔

۲-'' سردار بیگم کی یہ خواہش تھی کہ کرائے کا مکان چھوڑ کر اپنا مکان تعمیر کرائیں اور اس میں رہائش اختیار کریں' لیکن اقبال کے پاس ان مطالبات کے جواب میں ایک کھسیانی سی مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔''(۲۳)

کھسیانی سی ہنسی ہوتی ہے مسکراہٹ نہیں۔ پھر یہ بھی کہ 'کھسیانی سی 'مسکراہٹ' کا علامہ سے انتساب سوٗ ادب ہے۔

۳-'' اب ان کے خیال میں اقبال کا مرض صرف شہ رگ کا پھیلاؤ یا ورم تھا' جو خون کے سمی مادوں یا نفس کے زیادہ استعمال کے سبب پیدا ہوسکتا تھا۔''(۲۴)

غالباً نفس کے زیادہ استعمال سے ڈاکٹر جاوید اقبال کی مراد تنفس سے ہے۔

۴-''جنوری ۱۹۳۵ء میں اقبال کا معروف اُردو مجموعۂ کلام بالِ جبریل لاہور سے شائع ہوا۔''(۲۵)

کیا بالِ جبریل کے علاوہ بقیہ مجموعہ ہائے کلام معروف نہیں۔ یقیناً ہیں' تو پھر بالِ جبریل کے ساتھ 'معروف' کی صفت کا اظہار کیا معنی؟ اسی طرح اس کی اشاعت کے سلسلے میں لاہور کی تخصیص کا کیا مطلب ہے؟ دیگر مجموعہ ہائے شعر ونثر کیا لاہور کے علاوہ کہیں اور سے بھی چھپے!

۵-''سردار بیگم کی بے وقت موت نے اقبال کو پژمردہ سا کر دیا۔''(۲۶)

موت قضائے الٰہی ہے' یہ بے وقت نہیں آتی۔ ایسا کہنا یا لکھنا شرعی اعتبار سے غلطی ہے۔

۶-''ستمبر ۱۹۳۶ء میں فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کی اشاعت ہوئی۔''(۲۷)

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ۳/اکتوبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

۷- اس جلد میں مع کو معہ' متنازع کو متنازعہ' مصرع کو مصرعہ' سنہ کو سن اور کیلنڈر کو کلنڈر لکھا گیا ہے اور بار بار لکھا گیا ہے۔

سات سو صفحات پر مشتمل زندہ رُود کی تینوں جلدیں ڈاکٹر جاوید اقبال کی نو سالہ محنت و تحقیق کا ثمر ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں علامہ اقبال کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور فکری زندگی کے اہم تر خدوخال، برصغیر کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں نمایاں کیے ہیں۔ ان جلدوں میں علامہ کی داستان حیات کے پہلو بہ پہلو برصغیر کی اہم شخصیات اور حالات کا تذکرہ بھی آ گیا ہے، مگر بعض معاملات اور واقعات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

زندہ رُود اقبالیاتی ادب کے سوانحی سرمائے میں اہم تر مقام کی حامل ہوتے ہوئے بھی تحقیقی، واقعاتی، لسانی اور املا کی اغلاط سے محفوظ نہیں رہی۔ نمونتاً حوالے متعلقہ مقامات پر دے دیے گئے ہیں۔ اب تک اس کتاب کے تین سے زائد ایڈیشن چھپ چکے ہیں، مگر ان میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی، تصحیح اور اضافہ نہیں کیا گیا۔ بعض مقامات نظرثانی اور اضافے کے مقتضی ہیں، مگر اس جانب بھی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کتاب کے ایک باب کے جواب میں ایک پوری کتاب اقبال اور احمدیت لکھی گئی، ضروری تھا کہ اس کا بھی جواب دیا جاتا اور اس گمراہ کن کتاب کی تردید کی جاتی، تاکہ قارئین، علامہ اقبال کے حقیقی عقائد اور نظریات سے آگاہ ہوتے۔

بحیثیتِ مجموعی سوانحی ادب میں زندہ رُود کا اپنا ایک بہت نمایاں اور اعلیٰ مقام ہے۔ جب تک کہ اقبال کی کوئی اور مکمل سوانح عمری مرتب نہیں ہو جاتی، بلاشبہ زندہ رُود ممتاز ترین کتاب سمجھی جاتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

۱- زندہ رُود (جلد سوم): جاوید اقبال؛ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز؛ ۱۹۸۷: ص الف۔ب۔
۲- ایضاً، ص ۲۹۷
۳- اقبال اور پنجاب کونسل: محمد حنیف شاہد: لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز: ۱۹۷۶ء، ص ۵۷
۴- زندہ رُود جلد سوم: ص ۳۰۸

۵- ایضاً،ص۳۴۲
۶- کلیاتِ اقبال (فارسی): محمد اقبال؛ لاہور: اقبال اکادمی، پاکستان؛ ۱۹۸۶ء:ص۵۷۲
۷- زندہ رُود جلدسوم:ص۳۴۳
۸- ایضاً،ص۳۴۸۔۳۵۰
۹- ایضاً،ص۳۹۲
۱۰- ذکرِ اقبال: عبدالمجید سالک؛ لاہور، بزم اقبال: س۔ن:ص۱۶۰
۱۱- زندہ رُود جلدسوم:ص۴۱۲-۴۱۳
۱۲- ایضاً،ص۴۱۹-۴۲۰
۱۳- ایضاً،ص۵۰۲
۱۴- ششماہی اقبالیات لاہور: جنوری تا جون:۱۹۸۶ء:ص۱۵۹
۱۵- زندہ رُود جلدسوم:ص۵۱۷
۱۶- ایضاً،ص۵۲۹
۱۷- ایضاً،ص۵۳۴
۱۸- ایضاً،ص۵۵۱-۵۵۴
۱۹- ایضاً،ص۵۵۷-۵۵۸
۲۰- ایضاً،ص۶۵۸-۶۶۴
۲۱- ڈاکٹر جسٹس(ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات: ص۳۲۰
۲۲- زندہ رُود جلدسوم:ص۵۲۵
۲۳- ایضاً،ص۵۳۱
۲۴- ایضاً،ص۵۳۸
۲۵- ایضاً،ص۵۴۶
۲۶- ایضاً،ص۵۴۹
۲۷- ایضاً،ص۵۶۹

☆☆☆☆☆

اشاریہ

انبیا علیہم السلام وصحابہ کرامؓ

حضرت نوح علیہ السلام : ۸۹

حضرت عیسیٰ علیہ السلام : ۱۲۱

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم: ۵۷، ۵۸، ۹۱، ۹۳، ۹۴، ۹۷، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۰۹

حضرت عمر رضی اللہ عنہ : ۱۰۷، ۱۰۹

حضرت علی رضی اللہ عنہ : ۵۸، ۶۸

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا : ۵۸

حضرت حسین رضی اللہ عنہ : ۶۴

☆☆☆☆

دیگر شخصیات

آربری، پروفیسر: ۱۵، ۱۶

آرنلڈ: ۶۶

آسین پیلاکیوس، پروفیسر: ۱۱۵

آغا خان، سر: ۵۲، ۱۲۲

آفتاب اقبال: ۲۷

آئن اسٹائن: ۱۰۵

ابراہیم، سلطان: ۱۳۲

ابن ابی یعلی بن الفرہ: ۳۴

ابن بطوطہ: ۱۱۷

ابن رشد: ۱۰۵

ابن سعود: ۱۰۳

ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد: ۳۴، ۴۹

ابوالمعالی: ۱۰۵

ابوحنیفہ، امام: ۱۰۷، ۱۲۴

ابو یوسف، امام: ۳۴

(محمد) احمد خان: ۱۱۹

احمد دین ایڈووکیٹ: ۵۶

احمد دین، مولوی: ۷۸

احمد شاہ درانی: ۱۱۸

احمد ندیم قاسمی: ۳۰

احمد، شیخ: ۱۳

ارسطو: ۲۱، ۳۰

اسلم، قاضی: ۱۵

اسلوب احمد انصاری: ۳۹، ۵۸، ۷۰

اشفاق احمد: ۱۶
اشوکا مہتہ: ۲۳
اعجاز احمد، شیخ: ۶۱، ۹۲، ۱۲۳
افتخار احمد صدیقی: ۳۳
افتخار عارف: ۶
(محمد) اقبال، علامہ: ۷، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۵، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴
اکبر الہ آبادی: ۸۶
اکبر حیدری، سر: ۷۸
(محمد) اکرم: ۱۱
الطاف حسین حالی: دیکھیے ''حالی''
الف دین وکیل: ۸۶
امتیاز علی تاج: ۱۸
امتیاز علی خان عرشی: ۴۴
امداد، مولانا نواب: ۸۵
انتھونی: ۱۶
انوار اقبال: ۸۶
اے جے آربری، پروفیسر: ۱۵، ۱۶
ایاز: ۳۱، ۳۳
ایرانی حیدری: ۱۶
ایس ایم اکرام: ۴۴
(محمد) ایوب خان، صدر: ۳۰، ۳۴، ۳۵
بابر: ۱۱۸
برکات احمد، سید: ۱۰۸
بشیر احمد ڈار: ۸۶
بشیر الدین، مرزا (قادیانی): ۵۳، ۱۲۱
بصیرہ عنبرین، ڈاکٹر: ۵
بہلول دانا: ۱۳۲
بھٹو: دیکھیے ذوالفقار علی بھٹو
پورن: ۶۳
تاراچند، ماسٹر: ۱۶، ۲۸
تغلق: دیکھیے فیروز تغلق
تنویر ظہور: ۲۲، ۲۸، ۲۹، ۳۳
ٹیپو سلطان: ۷۲
جان سمتھ، سر: ۸۹
جاوید اقبال، ڈاکٹر جسٹس: ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۵،

۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۷، ۲۸،
۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵،
۳۶، ۳۹، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۵، ۴۶،
۴۷، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹،
۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶،
۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۴، ۷۷،
۷۸، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۶، ۸۷،
۸۸، ۸۹، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶،
۹۷، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۱،
۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۳،
۱۲۴، ۱۲۵، ۱۳، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳
جلال الدین، مرزا: ۹۱
جمال الدین افغانی: ۲۶، ۱۲۹
جمال الدین، شیخ: ۶۱، ۶۲
جمال محمد، سیٹھ: ۱۰۵
جمیل جالبی، ڈاکٹر: ۴۷، ۹۹
جناح: دیکھیے محمد علی جناح
جواہر لعل نہرو: دیکھیے نہرو
جولیس سیزر: ۱۶
جونپوری، مُلّا: ۱۰۸
چراغ حسن حسرت: ۳۰
حافظ: ۸۷، ۸۸
حالی: ۶۸
حریم: ۱۲
حسن اختر، ملک: ۹۸
حسن نظامی، خواجہ: ۷۸، ۸۶، ۸۷، ۸۸
حسن، سید: ۶۴
(محمد) حسین، چودھری: ۱۴، ۱۶، ۲۰، ۲۸،
۳۲، ۳۳، ۱۲۳
حسین احمد مدنی، مولانا: ۸۲، ۱۰۴، ۱۲۴
حفیظ ملک، ڈاکٹر: ۲۴
(محمد) حنیف شاہد: ۱۰۳، ۱۳۳
خان نیاز الدین خان: ۴۹
(محمد) خلیل، پروفیسر: ۱۱
داتا گنج بخش: ۱۱۸، ۱۳۲
داغ: ۷۳
داہر، راجہ: ۱۹
دیدار علی، مولانا: ۸۲
(محمد) دین فوق: ۵۹، ۶۱، ۶۳
(محمد) دین، ملک: ۱۰۲
ڈائر، جنرل: ۸۹، ۹۴
ڈکنسن: ۱۶
ڈنلوپ: ۱۶
ذوالفقار علی بھٹو: ۱۶، ۱۹
ذوالفقار علی خان، نواب: ۵۶، ۹۱
راس مسعود، سیّد سر: ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸
راشد حمید، ڈاکٹر: ۵، ۶، ۷، ۱۲
راغب اصفہانی: ۱۰۹

رام پرشاد، لالہ: ۸۰
رحمت علی، چودھری: ۱۱۴
رحیم بخش شاہین: ۴۹
رضیہ سلطان: ۲۰
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: ۹، ۱۱
رفیع پیر: ۱۸
(محمد) رفیق، شیخ: ۶۱، ۶۲
(محمد) رمضان، شیخ: ۶۱، ۶۲
روبن لیوی، پروفیسر: ۱۶
روم، مولانا: ۱۲۳
رومی: ۲۴، ۲۶
زین العابدین بڈشاہ: ۵۹
سالک: ۶۸
سبکتگین، سلطان: ۱۳۲
سرسید احمد خان: ۶۶
سراج الدین پال ایڈووکیٹ: ۱۶، ۸۶
سردار بیگم: ۱۳، ۱۳۲
سرسید علی امام: ۸۵
سرور خان گویا: ۱۱۸
سعشہ خان: ۲۰، ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۴، ۴۱، ۵۰، ۶۰، ۶۲، ۷۰، ۷۴، ۱۳۱
سعیدہ وحید، بیگم: ۲۹
سلطان محمود: دیکھیے محمود
سلیمان ندوی، سیّد: ۸۸، ۱۱۶، ۱۱۸
سنائی، حکیم: ۱۱۸
سہنپال، راجہ: ۶۳، ۶۴
سیّد احمد شہید: ۶۴
شادی لعل، سر: ۹۶
شالباہن، راجہ: ۶۳
(محمد) شاہد حنیف: ۷
شاہ ولی اللہ: ۱۰۷، ۱۰۸
شاہین دخت صفیاری: ۴۲
شبلی نعمانی، علامہ: ۱۰۷، ۱۰۸
(محمد) شفیع، سر: ۱۱۲
شل، راجہ: ۶۳
شوکت علی: ۸۹
صادق المہدی: ۲۳
صائمہ: ۱۲
صباح الدین عبدالرحمٰن: ۴۰، ۴۱، ۱۱۶
(محمد) صدیق خان شبلی: ۹، ۱۱
(محمد) ضیاء الحق، جنرل: ۲۲، ۳۳
طاہر الدین، منشی: ۱۲۳
(محمد) ظاہر شاہ: ۱۱۸
ظفر اللہ خان (قادیانی): ۳۵، ۵۲، ۵۳
ظفر علی خان، مولانا: ۸۶
ظہیر الدین: ۱۱۸
عاشق حسین بٹالوی: ۹۰
عبدالحمید: ۱۵

عبدالرب نشتر، سردار: ۲۰
عبدالرحمٰن، شیخ: ۶۱، ۶۲
عبدالرحمن بجنوری: ۸۶
(محمد) عبدالرزاق: ۹۷
عبدالرزاق، مولوی: ۸۷
عبدالغنی، خواجہ: ۱۴، ۱۲۳
عبدالقادر: ۵۶
(محمد) عبداللہ، شیخ: ۵۳، ۶۱، ۶۲
عبداللہ عمادی، مولانا: ۸۶
عبداللہ قریشی: ۸۶، ۸۷
عبدالماجد، شیخ: ۴۷، ۵۱
عبدالمجید سالک: ۴۰، ۱۳۴
عبدالواحد معینی: ۸۶
عبدالوحید، ڈاکٹر: ۲۹
عبدالوہاب نجدی: ۱۲۹
عطا محمد، شیخ: ۱۴، ۵۱
عطیہ فیضی: ۷۰
علامہ اقبال: دیکھیے محمد اقبال، علامہ
علی بخش: ۷۳، ۱۱۷
علی برادران:
علی برادران: ۸۸، ۹۱
علی شریعتی: ۲۵
علی لاحق الحق، امام: ۶۴
غالب: ۴۴
غلام رسول خان: ۱۱۷
غلام رسول مہر، مولانا: ۴۰، ۴۴، ۴۸، ۵۳، ۸۶
غلام محمد: ۶۲
غلام ناصر خان، ماسٹر: ۱۶، ۲۸
فارابی: ۳۶
فضل حسین، سر: ۵۲، ۵۳
فوق: دیکھیے محمد دین فوق
فیروز تغلق، سلطان: ۶۳، ۶۴
فیروز الدین، مولوی: ۲۹
قائداعظم: دیکھیے محمد علی جناح
قربان، مُلّا: ۱۳۲
قمر الاسلام: ۲۷
قیصر: ۹۱
کارل مارکس: ۱۲۶
کریم بی بی: ۹۳
کشن پرشاد شاد: ۸۷
کمال اتاترک: ۲۵
کیپٹن برگز: ۸۹
گاندھی: ۹۰
گب، پروفیسر: ۱۶
گوئٹے: ۲۶، ۵۸
لائے خوار: ۱۱۸
لطیف: ۱۶
لول حج، بابا: ۵۹، ۶۰، ۷۱، ۷۲

مالک رام: ۴۴
مائیکل اڈوائر: ۹۰
مبارک، قاضی: ۱۰۹
مجدد الف ثانی: ۲۷
محراب گل افغان: ۱۱۶
محسن رضا، سیّد: ۲۰
محمد بن قاسم: ۱۹، ۹۶
محمد علی جناح، قائداعظم: ۱۱۴، ۱۲۸، ۲۱، ۲۵، ۳۴، ۵۲
محمد علی جوہر، مولانا: ۹۰
محمود علی، مولوی: ۸۶
محمود غزنوی: ۱۱۸
محمود نظامی: ۴۸
محمود: ۳۱، ۳۳
محمود، سلطان: ۱۱۸، ۱۳۲
محی الدین ابن عربی: ۱۰۸
محی الدین مسکین، ابومحمد حاجی: ۷۱
مختار بیگم: ۹۶
مراد، سلطان: ۱۹
مریم: ۱۲
مسز ڈورس احمد: ۵۱
معین الدین جمیل: ۸۸
منٹگمری واٹ، پروفیسر: ۱۶
منظور قادر: ۳۵
منیب اقبال: ۱۷، ۲۹، ۵۵
منیر، جسٹس: ۳۴، ۳۵
منیرہ بیگم: ۱۳، ۱۲۳
مہاراجہ چندر گپت بکر ماجیت: ۶۳
مودودی، مولانا: دیکھیے ابوالاعلیٰ مودودی
موسیٰ بن ہیمون، حکیم: ۱۰۷
میر حسن، مولوی: ۶۶
میرزا ادیب: ۳۰
نادر شاہ شہید: ۱۱۸، ۱۱۶، ۱۱۸
ناصرہ جاوید اقبال: ۵، ۱۷، ۲۸، ۲۹
نثار احمد قریشی، ڈاکٹر: ۱۱
نذیر نیازی، سیّد: ۱۲۱
نرندر ناتھ، راجہ: ۸۵
نصر الدین، بابا: ۵۹، ۶۰
نکرو ما، صدر: ۲۳
نکلسن، ڈاکٹر: ۱۲۳
نہرو، پنڈت: ۵۲، ۵۳، ۱۲۲
نواب صاحب چھتاری: ۸۵
نواز شریف، میاں: ۲۲
نور الدین ولی، شیخ: ۵۹، ۶۰
نور محمد، شیخ: ۲۷، ۶۲
ہادی حسن، پروفیسر: ۱۱۷
ہدایت حسین، خان بہادر حافظ: ۸۵
وجاہت حسین جھنجھانوی: ۷۳

وحید، ڈاکٹر: ۲۹
ولسن، پریذیڈنٹ: ۹۱
ولید اقبال: ۱۷، ۲۹، ۵۵
ولیم میور، سر: ۷۲
Bapsi Sidhwa: ۳۱

☆☆☆☆

اماکن

آزاد کشمیر: ۵۳
آسٹریلیا: ۲۳، ۲۴
ابوظہبی: ۲۵
ادانہ: ۲۶
اردن: ۲۵، ۲۶
استنبول: ۲۶
اسلام آباد: ۶، ۷، ۱۷، ۱۹، ۲۶
افغانستان: ۵۱، ۹۲، ۹۳، ۱۰۱، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۳۲
الٰہ آباد: ۱۰۳، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴
الحسنین منزل، حسن مارکیٹ: ۵۱
امرتسر: ۸۹، ۹۱
امریکہ: ۱۷، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۹
انارکلی: ۱۴، ۹۰
انبالہ: ۶۲
انقرہ: ۲۵، ۲۶
انگلستان: ۱۶، ۱۱۳، ۱۱۵
اوسلو: ۲۵
ایران: ۲۲، ۲۴، ۲۶، ۴۲، ۹۳، ۱۱۹، ۱۲۹
ایشیا: ۲۶
برصغیر: ۱۵، ۲۹، ۵۱، ۶۳، ۶۶، ۷۲، ۷۸، ۸۸، ۹۳، ۹۵، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۱۰، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۳
برطانیہ: ۲۳، ۹۲، ۱۱۲
بمبئی: ۳۰
بنگال: ۱۱۱
بنگلور: ۱۰۵
بھاٹی گیٹ: ۱۴
بھارت: ۲۳، مزید دیکھیے ہندوستان، انڈیا
بیت الاقصیٰ: ۵۲
پاکستان: ۱۵، ۱۹، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۹، ۳۱، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۴۰، ۴۲، ۷۲، ۸۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۳۴
پان سلوانیا: ۲۴
پانی پت: ۶۸
پرگنہ آدوَن: ۶۰
پشاور: ۱۱۷
پنجاب: ۶۳، ۹۰، ۱۰۳، ۱۱۳، ۱۲۱، ۱۲۸

پھلواروی: ۱۰۸
پین سلوانیا: ۲۵
ترکی: ۱۷، ۲۲، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۹۱، ۹۳، ۱۲۲، ۱۲۹
ترکیہ: ۹۰
تہران: ۲۴، ۲۶، ۱۳۰
ٹیکساس: ۲۴
جاوید منزل: ۱۷
جرمنی: ۲۵
جلال پور جٹاں: ۶۲
جلیانوالہ باغ: ۸۸، ۸۹، ۹۰
جنوبی ہند: ۱۰۱، ۱۰۵، ۱۱۰
جنیوا: ۲۴
جیٹھی کے: ۶۲
چرار شریف: ۶۰
چمن: ۱۱۸
چین: ۱۸، ۲۵
حیدرآباد دکن: ۶۱، ۷۸، ۹۷، ۱۰۵
حیدرآباد: ۱۲۳
خیبر: ۱۱۸
دارالامان: ۱۱۷
دبئی: ۲۵
دمشق: ۲۵
دہلی: ۶۳، ۹۰
دیاربکر: ۲۶
ڈیٹرائیٹ: ۲۶
رامپور: ۱۰۸
راولپنڈی: ۱۷
روپڑ: ۶۲
روس: ۲۳، ۲۵، ۹۳، ۱۰۹
سالسبرگ: ۲۴
سان فرانسسکو: ۲۴، ۲۵
سپین: ۱۱۵
سڈنی: ۲۳
سرحد: ۱۱۸
سرنگاپٹم: ۷۲
سرہند شریف: ۱۳، ۲۷
سعودی عرب: ۲۲
سندھ: ۱۹
سوڈان: ۲۳
سوئٹزرلینڈ: ۲۴
سیالکوٹ: ۱۳، ۵۰، ۵۵، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۸۳
شاکل: ۶۳
شام: ۲۵
شکاگو: ۲۵
علی گڑھ: ۴۹، ۷۴، ۷۹، ۸۹، ۱۰۵، ۱۱۰
عمان: ۲۵، ۲۶

غزنی: ۱۱۸
فلسطین: ۱۸، ۱۱۵
قادیان: ۵۲
قرطبہ: ۱۰۷
قسطنطنیہ: ۹۱
قصر دلکشا: ۱۱۸
قلعہ شالکوٹ: ۶۳
قندھار: ۱۱۸
قونیہ: ۲۶
قیصریہ: ۲۶
کابل: ۱۱۷، ۱۱۸
کراچی: ۱۸، ۲۳
کشمیر: ۳۳، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۲، ۹۵، ۱۱۴
کلکتہ: ۱۲۲
کوالالامپور: ۲۶
کوہستان کانگڑہ: ۶۴
کیلگری: ۲۵
کیمبرج: ۱۵، ۱۶، ۲۹، ۶۹، ۷۳، ۱۱۵
گجرات: ۸۳
گھانا: ۲۳
لاہور: ۵، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۲۳، ۳۳، ۳۳، ۵۳، ۴۶، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۵، ۵۸، ۶۱، ۶۶، ۷۴، ۷۷، ۸۰، ۹۰، ۹۶، ۹۸، ۹۹، ۱۰۳، ۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴
لکھنؤ: ۵۶، ۹۰
لندن: ۱۵، ۱۶، ۲۵، ۵۲
مدراس: ۱۰۵
مدردیش: ۶۳
مدینہ: ۲۴، ۶۹، ۸۵
مسجد قرطبہ: ۱۱۵
مشہد: ۲۵
مصر: ۱۲۹
مغربی ہند: ۱۱۱
مقبرہ جہانگیر: ۹۶
ملائیشیا: ۲۶
موضع کودل: ۶۳
مونٹریال: ۲۵
میڈرڈ: ۱۱۵
میسور: ۷۲، ۱۰۵
میکسیکو: ۲۳
ناروے: ۲۵
نالہ ایک: ۶۴
نجف: ۶۹
نیو شمس آباد، لاہور: ۵۱
نیو یارک: ۲۹

ہارورڈ: ۲۹
ہائیڈل برگ: ۶۹
ہسپانیہ: ۱۱۵
ہندوستان: ۳۰، ۴۲، ۷۸، ۹۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۲۲
ہیوسٹن ٹیکساس، امریکہ: ۲۶
وینکوور: ۲۵
یورپ: ۲۳، ۲۸، ۵۰، ۵۵، ۶۶، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۷، ۸۰، ۹۱، ۹۳، ۱۰۴

☆☆☆☆

ادارے/ جماعتیں

آل انڈیا ریڈیو: ۱۸
آل انڈیا کشمیر کمیشن: ۵۳
آل انڈیا مسلم کانفرنس: ۹۰
آل انڈیا مسلم لیگ: ۱۰۳، ۱۱۴، ۱۲۸
آل پارٹیز مسلم کانفرنس: ۱۲۸
آل البیت اکادمی، عمان، اردن: ۲۶
اپوا: ۲۹
ادارہ فروغ قومی زبان: ۷
استنبول یونیورسٹی، ترکی: ۲۳، ۲۵
اسلامیہ کالج: ۲۰
اسلامیہ کالج پشاور: ۱۱۷
اسلامیہ کالج لاہور: ۱۲۳
اسلامیہ ہائی سکول، بھاٹی گیٹ: ۱۴
اقبال اکادمی کراچی: ۲۳
اقبال اکادمی لاہور: ۵، ۳۲، ۴۹، ۱۳۴
اقوام متحدہ: ۲۴
اکادمی ادبیات پاکستان: ۵، ۶، ۷
الازہر یونیورسٹی: ۲۴
امپریل انسٹی ٹیوٹ: ۷۰
انجمن ترقی اردو: ۷۲
انجمن حمایت اسلام: ۱۴، ۷۹، ۱۲۳
انڈیانا پولس: ۲۴
انز آف کورٹ: ۱۵
انقرہ یونیورسٹی، ترکی: ۲۳، ۲۵
اورینٹل کالج: ۷۷
اولڈ بوائز ایسوسی ایشن: ۸۹
این آربر یونیورسٹی: ۲۶
بارسلونا یونیورسٹی، سپین: ۲۶
برکلے یونیورسٹی: ۲۴
بزم اقبال: ۸۶، ۱۳۴
بی بی سی: ۱۶
بیلا جیوا اٹلی: ۲۴
پاکستان تھنکر زفورم: ۲۵
پاکستان ٹیلی ویژن: ۳۵
پاکستان فلاسفیکل کانگریس لاہور: ۳۱
پروفیشنلزم فورم، دبئی: ۲۵

پشاور یونیورسٹی: ۲۹
پنجاب کونسل: ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۲
پنجاب لجسلیٹو کونسل: ۱۰۱
پنجاب یونیورسٹی: ۱۶، ۲۹
پولیٹیکل اکانومی: ۶۷
تہران یونیورسٹی: ۲۴
ٹورنٹو یونیورسٹی: ۲۵
جماعت احمدیہ: ۵۲، ۵۳
جماعت اسلامی: ۳۵
خلافت کانفرنس: ۸۸، ۹۰، ۹۱، ۹۲
رائٹرز گلڈ، کراچی: ۲۳
رائل اکادمی، عمان: ۲۵
رفاہ پارٹی: ۲۶
روٹری کلب لاہور: ۵۳
روس اکادمی آف سائنسز: ۲۵
ریڈیو سٹیشن، لاہور: ۲۰، ۲۱
ساؤتھ ایشین سٹڈیز فیکلٹی: ۲۴
سائمن کمیشن: ۱۱۲
سپریم کورٹ: ۱۹
سڈنی یونیورسٹی: ۲۳
سلجوق یونیورسٹی قونیہ، ترکی: ۱۷
سنٹرل ماڈل ہائی سکول: ۱۴، ۲۸
سورج پبلشنگ بیورو: ۵۰
سورج پبلشنگ ہاؤس: ۷۴
سیکرڈ ہارٹ مشن ہائی سکول، لاہور: ۱۴
سینٹ فرانسس سکول: ۱۴
شیخ غلام علی اینڈ سنز: ۳۱، ۳۳، ۵۰، ۵۱، ۵۸، ۷۴، ۹۷، ۱۳۳
طالبان: ۲۲
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی: ۱۷، ۲۶
علی شریعتی یونیورسٹی، مشہد: ۲۵
علی گڑھ کالج: ۸۹
عین الشمس یونیورسٹی: ۲۴
غلام علی اینڈ سنز: دیکھیے شیخ غلام علی اینڈ سنز
فاطمہ میموریل ہسپتال: ۲۹
فضل حق سنز پبلشرز: ۲۸
فیروز سنز: ۲۹
فیض اکادمی: ۲۵
فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن: ۲۹
قاہرہ یونیورسٹی: ۲۴
قومی اتحاد: ۳۵
کانگریس: ۸۲، ۸۸
کشمیر کمیٹی: ۵۳
کلیسا ہیوسٹن: ۲۴
کنیرڈ کالج: ۲۹
کیمبرج یونیورسٹی: ۱۵، ۲۹
کینبر یونیورسٹی، آسٹریلیا: ۲۳
گورنمنٹ کالج، لاہور: ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸،

۲۰، ۲۹، ۵۰، ۵۵، ۶۶، ۷۷، ۸۰
گورنمنٹ کالج سیالکوٹ: ۶۵
گول میز کانفرنس: ۱۰۱، ۱۱۲، ۱۱۵
لاکالج لاہور: ۲۹
لاہور ہائیکورٹ: ۱۶، ۲۹
لنکنز ان: ۱۵
لیجسلیٹو کونسل: ۱۰۳
لیگ آف نیشنز: ۲۹
مجلس ترقیِ ادب: ۳۳، ۹۹
مرکزیہ مجلس اقبال: ۳۳
مسلم سوشل سائنٹسٹس: ۲۴
مسلم لیگ: ۱۶، ۲۲، ۳۵، ۵۲، ۱۱۳، ۱۲۸
مکتبہ اردو، لاہور: ۳۰
ہارورڈ لاسکول، امریکہ: ۲۶
ہائی کورٹ لاہور: ۱۲۰
ہائیڈل برگ یونیورسٹی: ۲۵
ہوائی یونیورسٹی: ۲۵
ولانووا کیتھولک یونیورسٹی: ۱۷، ۲۹
ویلانووا یونیورسٹی امریکہ: ۲۴، ۲۵، ۲۶
یو این او: ۲۳، ۲۹
یونینسٹ پارٹی: ۱۲۸
یونیورسل بکس: ۹۸

☆☆☆☆

کتب ورسائل

آئیڈیالوجی آف پاکستان: ۳۴، ۳۵
اپنا گریباں چاک: ۱۱، ۱۵، ۱۹، ۲۰، ۲۲، ۲۳، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۳، ۳۶
احسان، روزنامہ: ۶۰
احکام السطانیہ از قاضی ابن ابی یعلی بن الفرہ: ۳۴
ادب لطیف: ۳۰
ادبی دنیا: ۶۰
ارلی پلانچنٹس: ۶۷
ارمغان اقبال: ۴۹
اسٹیٹسمین: ۱۲۰
اسرار خودی: ۷۷، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۸، ۹۶
اسلام اور پاکستان کی شناخت: ۲۲
اسلام اور پاکستان: ۲۲
اسلام کے نمائندے: ۱۲۱
افکار اقبال تشریحات جاوید: ۲۲
اقبال، سہ ماہی: ۸۶
اقبال اور احمدیت: ۴۷، ۵۱، ۵۴، ۱۳۳
اقبال اور پنجاب کونسل: ۱۰۳، ۱۳۳
اقبال ایک تحقیقی مطالعہ: ۹۸
اقبال کا تصور اجتہاد: ۲۱
اقبال کے حضور: ۶۰، ۶۵

اقبالیات، مجلہ: ۴۹، ۵۰، ۱۳۴
امروز: ۲۱، ۳۰
انقلاب: ۱۱۱، ۱۱۲
اودھ پنچ: ۶۸
بال جبریل: ۱۳۲
بانگ درا: ۷۸، ۹۱، ۹۶، ۱۰۴
بخاری: ۱۰۷
برطانوی ہند: ۶۵
پاکستانی ادب کے معمار: ۶
پرتاب اخبار: ۱۱۱
پس چہ باید کرد اے اقوام شرق: ۱۳۰، ۱۳۲
پیام مشرق: ۵۸، ۹۲، ۹۶
تاریخ ادب اردو: ۴۷، ۹۷، ۹۹
تاریخ اعظمی: ۶۰
تاریخ اقوام کشمیر: ۶۴
تاریخ بڈشاہی: ۶۰
تاریخ سیالکوٹ: ۶۴
تاریخ ہند: ۸۰
تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار: ۷۱
تخلیق مکرر: ۲۰
تسویلات فلسفہ: ۱۰۸
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: ۳۴
تقریبات سال اقبال: ۲۶
جاوید نامہ: ۲۷، ۵۷، ۵۸
جنگ، روزنامہ: ۳۳
جہان اقبال: ۳۵
حجۃ اللہ البالغہ: ۱۰۷، ۱۰۸
حیات جاوید: ۶۵
خدنگ نظر (لکھنؤ)، ماہنامہ: ۵۶
خطباتِ اقبال: ۴۸
خطبات الاحمدیہ: ۷۲
دیوان غالب: ۲۸
دیوان مرزا عبدالقادر بیدل: ۱۲۳
ذکرِ اقبال: ۶۵، ۶۸، ۱۳۴
ڈاکٹر جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال: شخصیت اور ادبی خدمات: ۲۰، ۲۷، ۲۹، ۳۱، ۳۴، ۵۰، ۶۰، ۷۴، ۷۵، ۱۳۴
ڈان، روزنامہ: ۲۱
راوی، مجلہ: ۱۷، ۱۸
روزگار فقیر: ۶۱، ۷۴
زبان دہلی: ۷۳
زمیندار: ۵۳، ۹۷
زندگی، لاہور: ۳۵
زندہ رُود کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ: ۵، ۷
زندہ رُود: ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۷، ۲۱، ۳۳، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۲، ۴۳،

۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹،
۵۰، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸،
۵۹، ۶۵، ۶۶، ۷۰، ۷۱، ۷۴،
۷۵، ۷۷، ۷۹، ۸۸، ۹۷، ۹۸،
۹۹، ۱۰۱، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۹،
۱۲۴، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴
سرالاسرار: ۸۸
سن رائز، ہفت روزہ: ۱۲۰
سول اینڈ ملٹری گزٹ: ۱۸
سویرا: ۱۸، ۳۰
سیالکوٹ گزیٹیر: ۵۱
سیرافغانستان: ۱۱۸
سیرت سید احمد شہید: ۶۴
شمس بازغہ: ۱۰۷
شور محشر: ۷۳
صحیح بخاری: ۳۴
صدرا: ۱۰۷
ضرب کلیم: ۶۰
طلوع اسلام: ۱۲۱
علم الاقتصاد: ۶۷، ۹۷
فرام جناح ٹو ضیاء: ۳۵
قرآن مجید: ۲۷، ۳۴، ۴۸، ۱۰۶، ۱۰۹،
۱۱۸، ۱۲۳
قراردادِ پاکستان: ۱۱۳
قراردادِ لاہور: ۱۱۳
کتاب الخراج از امام ابویوسف: ۳۴
کلکتہ ریویو: ۶۵
کلیاتِ اقبال: ۴۰، ۷۸، ۹۷، ۱۳۴
لائیٹ، ہفت روزہ: ۱۲۰
لنڈن ٹائمز: ۹۶
ماڈرن ریویو: ۱۲۲
ماہ نو، کراچی: ۱۸
مثنوی مولانا روم: ۱۲۳
مجموعہ اقبالیاتِ مہر: ۴۸
مخزن: ۵۶، ۶۷، ۶۸
مراۃ المثنوی: ۱۲۳
مسدس حالی: ۲۸
مضامین تہذیب الاخلاق: ۶۵
مطالب اسرار ورموز: ۸۶
معارف: ۸۵
مفردات: ۱۰۹
مقالاتِ اقبال: ۸۶
مقدمہ ابن خلدون: ۳۴
منیر انکوائری رپورٹ: ۳۴
منیر رپورٹ: ۳۵
مہابھارت: ۶۳
موطا امام مالک: ۳۴
میراثِ قائداعظم: ۲۲، ۳۴

مئے لالہ فام: ۲۱، ۲۷، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۹، ۴۱
نرگس، ممبئی: ۱۸، ۳۰
نظریہ توحید مطلق (انگریزی): ۶۷
نقد و نظر: ۴۹، ۷۴، ۷۵
نقوش، ماہنامہ: ۱۸، ۶۰
نوائے اسلام: ۲۱، ۳۱
نوائے وقت: ۲۹
نورالاسلام، مولوی: ۱۰۸
ہند کا تاریخی جغرافیہ: ۶۵
ہند میں جدید اسلام: ۶۵
ہندی مسلمان: ۶۴
ویدانت: ۸۷
یادیں: ۲۲، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۳
۱۹۴۸ء کا بہترین ادب: ۳۰
From Jinnah to Zia: ۳۴
Life of Muhammad: ۷۲
Quest for Truth: ۳۱
The Crow Eater: ۳۱
The Ideology of Pakistan its implementation: ۲۲
The Stray Reflections: ۲۱، ۳۳

☆☆☆